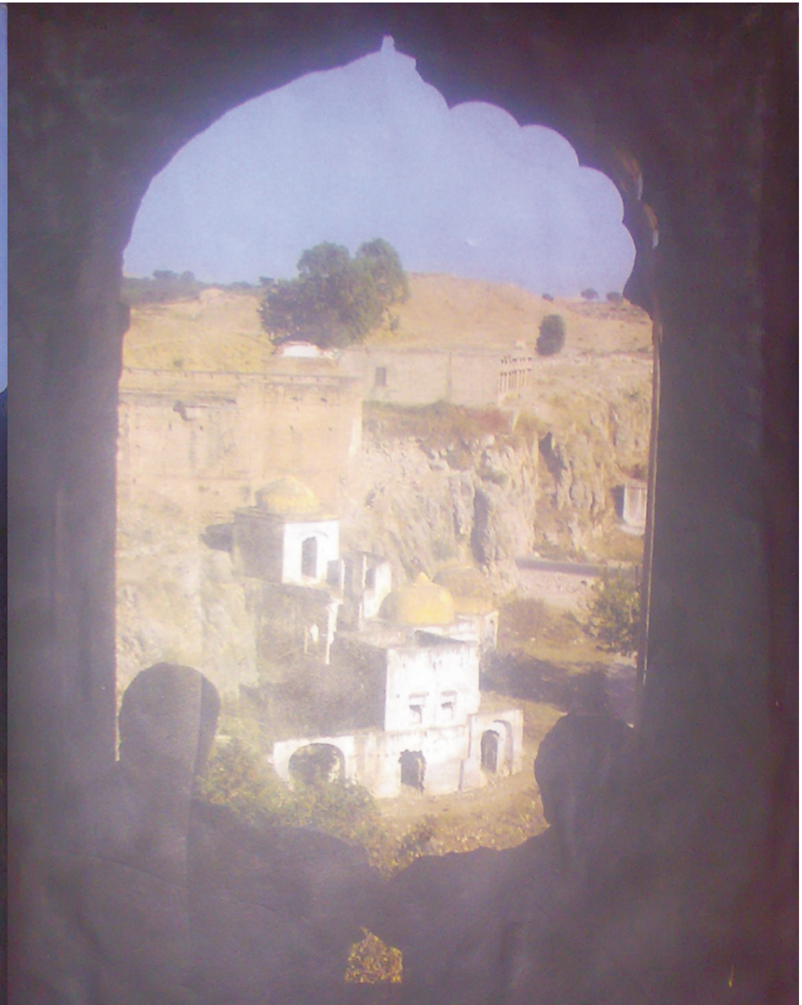




کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

کوثر محمود

ایک حرفِ دعا سکھا دے مجھے
تیرے ہاں جس کی ہو پذیرائی

کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

کچھ اپنے رنگ بکھرنے دو
کچھ اپنی خوشبو بکھراؤ
اور شیریں شبنمی لہجے میں، کوئی نرم ملائم بات کرو
جس لمحے میں موجود ہیں ہم، یہ لمحہ موج ہے ساگر کی
تم اِس لمحے کے ساتھ بہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

تاریخ کے جبر کی بات ہی کیا
ہم دونوں کی اوقات ہی کیا
کچھ رُوپ کا سونا دان کرو، خیرات اپنی مُسکان کرو
ہم جیسے شاعر لوگوں کا جینا مرنا آسان کرو
صندل سی باہیں پھیلاؤ، کچھ نظمیں غزلیں دے جاؤ

جو شائد باقی رہ جائیں
پھر دو سو سال کے بعد کوئی نقاش کمالِ فن کر دے
اپنی ہر پَور قلم کر دے
اور راج کٹاس کے پتھر پر
اِک لوک روایت نقش کرے
ہم دونوں کو تمثیل کرے، آئینہ عکس پہ عکس کرے
جس عکس پہ خوشبو لہرائے، جس نقش پہ تتلی رقص کرے

پھر ایک ہزار برس گزریں، پھر چار ہزار برس گزریں
آثار شناسی کے ماہر اِس دور کی جب تحقیق کریں
اِس رسمُ الخط کو پہچانیں، اِس لمحے کی تصدیق کریں
یہ لمحہ قائم دائم ہو
اِس لمحے کی سب کو ملتا، اُس عہد کے شاعر تک پہنچے
یہ قصہ آخر تک پہنچے
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو
کوئی کیا جانے، لمحہ بھر میں، یہ لمحہ اپنے ساتھ نہ ہو
کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو

سدھارتھ کی طرح تم کو پتہ ہے

سدھارتھ کی طرح تم کو پتہ ہے
آنے والا کل تمہارا ہے
وہ یوں کہ لمحہ موجود اب تک ملتجی ہے
تم اجازت دو تو وہ گزرے
جو تم چاہو، تمہارے لمس کا اعجاز
بنجر، سخت، پتھریلی زمینوں کو بھی، پل بھر میں ہرا کر دے
جو تم چاہو، تمہاری شبنمی آواز
سورج کو سمندر میں کھڑا کر دے

ذرا آئینہ تو دیکھو، تمہیں کس نے بنایا ہے
تبسم۔ مرمریں مورت، تراشیدہ زمانوں کی
تکلم۔ شعرِ غالبؔ، خامشی منٹو فسانوں کی
ادا۔ مانی کی تصویریں، جھلک بہزاد کے آئینہ خانوں کی

سدھارتھ بھی اگر ہوتا، زبانِ حال سے کہتا
تمہارا ہے، تمہارا ہے
گزرتے وقت کا دھارا
اجنتا اور ایلورا۔ ہڑپہ اور گندھارا
تمہارا ہے، تمہارا ہے

تمہیں جب سوچتا ہوں میں، گماں اکثر گزرتا ہے
چمکتے رُوپ کا سونا، مہکتے جسم کی چاندی
یہ صندل کا بنا پیکر، گلابوں سے بھری ڈالی
یہ خُلقِ بے بدل اپنا، یہ حُسنِ لم یزل اپنا
یونہی اِک دن، اچانک، تم کسی کو دان کر دو گے
اور اپنے عہد کے شاعر کو بس حیران کر دو گے

اُسے کہنا

اُسے کہنا کہ دنیا بھر کی سب اچھائیاں
اِک شخص میں یکجا نہیں ہوتیں
اُسے کہنا کہ خوابوں کے جزیروں سے نکل آئے

اُسے کہنا، کسی کچے گھروندے میں بھی کھل کر
رات کی رانی کی نکہت کم نہیں ہوتی
اُسے کہنا کہ ویرانے میں جا کر چاندنی مدھم نہیں ہوتی
اُسے کہنا، خزاں رُت میں شگوفے کھل نہیں سکتے
اُسے کہنا کہ دریا کے کنارے مل نہیں سکتے
اُسے کہنا، محبت اور خوشبو کے نصیبوں میں بکھرنا ہے
شناسا شہر میں، انجان رستوں سے گزرنا ہے
اُسے کہنا، یہ مشکل ہے، کسی افسردہ آنگن میں کوئی جانِ غزل آئے
اُسے کہنا، کہ خوابوں کے جزیروں سے نکل آئے

اُسے کہنا

اُسے کہنا کہ نورُستہ گلابوں کو
کوئی نامہرباں گر نوچ بھی ڈالے
تو خوشبو کا بدن ٹوٹا نہیں کرتا
اُسے کہنا، ذرا سی بے رُخی سے، یا گھڑی بھر کی خوشی سے
کبھی تارِ سخن ٹوٹا نہیں کرتا
اُسے کہنا، گلِ رُخ کی سبھی رعنائیاں
من چاہے لوگوں میں سبھی، دل کھول کر تقسیم کر دینا
ہمارا حق نہیں کوئی، مگر تسلیم کر لینا
ہمیں دو نیم کر دینا
عطائے خسروانہ سے مگر اک کام کر دینا
تمہارے گھر کے آنگن میں کبھی جب موتیا مہکے
تو خوشبو کا کوئی جھونکا ہمارے نام کر دینا
اُسے کہنا

اُسے کہنا

اُسے کہنا
ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
جہاں خوشبو معیّن راستوں پر ہی سفر کرنے کی عادی ہو
جہاں ہر روشنی کی سمت اور رفتار کی تنظیم ہوتی ہو
جہاں سر کے بجائے جبہ و دستار کی تعظیم ہوتی ہو
جہاں سب معبدوں میں جبر کی تعلیم ہوتی ہو
اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا

اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
جہاں سب آبلہ پا تتلیوں کو
برگِ گُل سے شبنمی ٹھنڈک نہ ملتی ہو
کسی بھی جس کے موسم میں کوئی رات کی رانی نہ کھلتی ہو
جہاں تخلیق کے سب آئنوں پر فکرِ نانِ شب کا سایہ ہو
ستارے زرد رُو سے ہوں، رُخِ خورشید میلا ہو

اُسے کہنا

اُسے کہنا کہ نوزستہ گلابوں کو
کوئی نامہرباں گر نوچ بھی ڈالے
تو خوشبو کا بدن ٹوٹا نہیں کرتا
اُسے کہنا، ذرا سی بے رُخی سے، یا گھڑی بھر کی خموشی سے
کبھی تارِ سخن ٹوٹا نہیں کرتا
اُسے کہنا، گلِ رُخ کی سبھی رعنائیاں
من چاہے لوگوں میں سبھی، دل کھول کر تقسیم کر دینا
ہمارا حق نہیں کوئی، مگر تسلیم کر لینا
ہمیں دو نیم کر دینا
عطائے خسروانہ سے مگر اک کام کر دینا
تمہارے گھر کے آنگن میں کبھی جب موتیا مہکے
تو خوشبو کا کوئی جھونکا ہمارے نام کر دینا
اُسے کہنا

اُسے کہنا

اُسے کہنا
ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
جہاں خوشبو معیّن راستوں پر ہی سفر کرنے کی عادی ہو
جہاں ہر روشنی کی سمت اور رفتار کی تنظیم ہوتی ہو
جہاں سر کے بجائے جبہ و دستار کی تعظیم ہوتی ہو
جہاں سب معبدوں میں جبر کی تعلیم ہوتی ہو
اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا

اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
جہاں سب آبلہ پا تتلیوں کو
برگِ گُل سے شبنمی ٹھنڈک نہ ملتی ہو
کسی بھی جبس کے موسم میں کوئی رات کی رانی نہ کھلتی ہو
جہاں تخلیق کے سب آئنوں پر فکرِ نانِ شب کا سایہ ہو
ستارے زرد رُو سے ہوں، رُخِ خورشید میلا ہو

جہاں سب چاند چہروں پر اُجالا بھی شعاعِ سیم و زر کے ساتھ رہتا ہو
جہاں ہر زِشت رُو خود کو پری چہرہ سمجھتا ہو
جہاں ناگفتنی ہر شخص کہتا ہو
جہاں ہر گھر کی دیواروں میں اِک دیوارِ گریہ ہو
اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا

اُسے کہنا، ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
جہاں کلیوں کی کوملتا سرِ بازار لٹ جائے
جہاں پر خوشبوؤں کا دم رگِ گُل میں ہی گھٹ جائے
جہاں بحرِ وفا پایاب ہو جائے
جہاں امراض وافر ہوں، شفا نایاب ہو جائے
جہاں چھوٹے پرندوں کی صدا معدوم ہو جائے
جہاں ہر علم اور معلوم، نامعلوم ہو جائے
جہاں آلودگی انسان کا مقسوم ہو جائے
اُسے کہنا ہمیں اُس شہر میں ہرگز نہیں رہنا
اُسے کہنا

اَے رُوپ نگر کی شہزادی

اَے رُوپ نگر کی شہزادی
کچھ زادِ سفر مل جائے تو آرام سے رستہ کٹ جائے
ہم جیسے شاعر لوگوں کو
اِک وعدۂ فردا کافی ہے
کب ہم نے کہا، تم ہم سے جینے مرنے کا پیمان کرو
اَے رُوپ نگر کی شہزادی
بس ایک تمنا ہے دل میں
جب اپنی نظر اُتارو تم
کچھ خواب ہمیں بھی دان کرو
اَے رُوپ نگر کی شہزادی

دیکھ تو!

دیکھ تو، تیرے گھر میں کیسی دودھیا روشنی پھیلی ہے
دیکھ تو، تیرے بام و در پہ کیسا رُوپ رُو پہلا ہے
دیکھ تو، سورج چاند ستارے تیری اور کھنچے آتے ہیں
دیکھ تو، تیرے آنگن میں مُشتاق ہوا نے کتنے پھُول بکھیرے ہیں
دیکھ تو، تیری پایل کی جھنکار میں کتنی کوملتائیں اُتری ہیں
دیکھ تو، تیری کھڑکی کے شیشے پر بیٹھی تتلی کے پس منظر میں،
رنگوں کی ردائیں اُتری ہیں
دیکھ تو، کتنی نرم ملائم، ڈری ڈری، شرمائی کرنیں، تیری چِلمن کے باہر،
دوزانو ہو کر، شرفِ زیارت کو بیٹھی ہیں
دیکھ تو، تیری چھت پر بیٹھی کوئل کی آواز میں برکھا، نچلے سپتک سے آگے
اب کیسے رِم جھم کرتی ہے
دیکھ تو، دنیا بھر کا رس، تیری مینا کے پنجرے کے اِک کونے میں سمٹا جاتا ہے

دیکھ تو، تیرے عکسِ رُخِ زیبا کی ایک جھلک سے کیسے، قوسِ قُزح
کے رنگوں کی ترتیب بدلتی جاتی ہے
دیکھ تو، تیرے پاؤں کو چھونے والی مٹی کی مہکار کے اک جھونکے
سے کتنے ہزاروں سالوں کی تہذیب بدلتی جاتی ہے
دیکھ تو، تیرے لمس کی رَو سے، صبحِ ازل کے حرفِ کُن میں، ایک نئی
سرشاری ہے
دیکھ تو، تیری ایک تجلّی سے کیسے پیرانِ صَوامع کے اجزائے ایماں
کی ترکیب بدلتی جاتی ہے

دیکھ تو، تیری بستی پر یہ کیسا موسم آیا ہے
دیکھ تو، تیرے گھر کے باہر، کاسۂ جاں کو ہاتھ میں لے کر،
تیرا گوتم آیا ہے

پہلا پتھر

تجھ کو شاید یاد تو ہوگا
تو نے یوں ہی چلتے چلتے، جھیل میں اِک پتھر پھینکا تھا
سطحِ آب پہ کچھ لہروں نے انجانے سے رسم الخط میں، اِک تحریر لکھی تھی
اور اُس مبہم مبہم سی تحریر کو پڑھنے کی کوشش میں
تیرے چہرے پر اِک لمحے کو ہلکا سا رنگ آیا تھا
لیکن کچھ ہی دیر کے بعد، اُس جھیل کے ٹھہرے ٹھہرے پانی پر کوئی تحریر نہیں تھی
یعنی کوئی لہر نہیں تھی

کتنے ہی برسوں کے بعد، اِک برفیلے سے موسم میں
اُس جھیل میں تو نے دوسرا پتھر پھینکا ہے
پر اب یخ بستہ پانی پر کوئی لہروں کی تحریر نہیں ہے
لیکن تیرے چہرے پر یہ سوچ کی شکنیں سی کیسی ہیں
دوسرا پتھر پھینکنے والے!
جھیل کے سینے میں ترا پہلا پتھر تو محفوظ پڑا ہے

کیا ہے تُو!

سیاہی رات کی زلفوں میں
صبح نور آنکھوں میں، سنہری دوپہر گالوں پہ
اور گُل رنگ ہونٹوں پر شفق آلودسی اِک شام ٹھہری ہے
خبر تجھ کو نہیں شاید
متاعِ فکر کی رعنائی تیرے نام ٹھہری ہے
ترے آئینۂ رُخ سے مُجّلی عکسِ زمانہ ہے
تری ہستی حقیقت ہے، ترا پیکر فسانہ ہے
ترے بارے میں اکثر سوچتا رہتا ہوں...... کیا ہے تُو؟
مری حدِ یقیں، حدِ گماں سے ماورا ہے تُو!

کبھی سوچا بھی ہے تُم نے

کبھی سوچا بھی ہے تُم نے
تمہارے گرد کتنے شوخ رنگوں کا بسیرا ہے
جہاں تم ہو وہاں کتنا اُجالا ہے
تو پھر اب کیوں، تمہارے آئینۂ رُخ پہ عکسِ گُل نہیں کھلتا
تمہاری جھیل آنکھوں میں، طلوعِ ماہ وانجم کا کوئی منظر نہیں ملتا
کبھی سوچا بھی ہے تم نے

تمہیں ملتے ہوئے......

تمہیں ملتے ہوئے اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ تم اِک پُھول ہو، سب رنگ پھیکے پڑ گئے جس کے
اور اپنی ساری خوشبو جو کہیں پر بھول آیا ہے
کبھی ایسا بھی لگتا ہے، کہ تم اِک منقسم پیکر ہو، جس کا جسم میرے پاس ہے
اور روح نادیدہ خلاؤں کے سفر پر کب سے نکلی ہے
کبھی بہرِ تکلف مسکراؤ بھی
تو اِک موہُوم سی مُسکان، مثلِ شمع، گُہر آلود طاقوں میں لرزتی ہے
کسی لمبے سفر سے آئی ہو جیسے، کنارِ لب پہ ہی تھک ہار کے دم توڑ دیتی ہے
مجھے کچھ پوچھنے کا حق نہیں لیکن
رُخِ ایام سے انجان لمحوں کی ردا سرکاؤ گے جاناں
مجھے اپنی اُداسی کا سبب بتلاؤ گے جاناں

احتجاج

میں جب اُس پیکرِ خوشبو پہ کوئی نظم لکھتا ہوں
تو میرے چار سُو بکھرے ہوئے دلکش مناظر
روٹھ جاتے ہیں

Foresight

ماما کوئی کوثر صاحب
پاکستان سے آئے ہیں

ٹھیک ہے بیٹا، اُن کو بٹھاؤ
پونی چمچ چینی ڈال کے چائے پلاؤ
اور سلیقے سے کہہ دینا
آج تو ماما گھر پہ نہیں ہیں

تمہیں ترکِ مراسم کا اگر صدمہ نہیں پہنچا

تمہیں ترکِ مراسم کا اگر صدمہ نہیں پہنچا
تو پھر کیوں آخرِ شب چاند نکلے تو
تمہاری جھیل آنکھوں کے کنارے بھیگ جاتے ہیں
تمہیں ترکِ مراسم کا اگر صدمہ نہیں پہنچا

جہاں تم ہو!

مجھے اُس شہر کے جملہ مکینوں سے محبت ہے
جہاں تم ہو!

بعنوانِ مسیحائی

بعنوانِ مسیحائی، کبھی ہم جاں بلب لوگوں سے بھی پوچھو، ہمارا مسئلہ کیا ہے
بعنوانِ مسیحائی

ابھی سے

ابھی سے شہرِ جاں میں کیوں بھلا تنہائیوں کے سائے لرزاں ہیں
ابھی تو رات آئی ہے، ابھی تو دن ڈھلا ہے
ابھی تو خوشبوئیں بھی اپنی پردوں سے باہر ہیں
ابھی تو چہرۂ خورشید پر کافی تمازت ہے
ہوا کو بھی ابھی زنجیرِ پا کے ساتھ گردش کی اجازت ہے
ابھی کیوں ذکرِ شامِ غم چلا ہے
ابھی تو رات آئی ہے، ابھی تو دن ڈھلا ہے

پنکچر شاپ

بڑے صاحب! یہاں، اِس شہر کے مصروف چوراہے پہ
قبرستان کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے جھانکتی سی
بیشتر فٹ پاتھ کو گھیرے، یہ اک چھوٹی سی پنکچر شاپ ہے میری
بسا اوقات جس کو بلدیہ
خوش باش اہلِ شہر کی نازک خرامی میں رکاوٹ جان کر چالان کرتی ہے
عدم تعمیل پر تذلیل کا سامان کرتی ہے

بڑے صاحب! بڑی مجبوریوں کے کشٹ کاٹے ہیں
کہ میں نے بچپنا، میلے کچیلے ہوٹلوں میں، گاڑیوں کی ورکشاپوں میں گزارا ہے
جہاں اِک حرفِ شیریں بھی سماعت تک نہیں پہنچا
سو میں چوتھی جماعت تک نہیں پہنچا

مرا مولا کرم کردے، میں ہر اِک حال میں راضی
کرم خوردہ صحیفوں میں جو اِک حرفِ عطا ہے، وہ نہیں لینا
مجھے آئین نے جو کچھ دیا ہے، وہ نہیں لینا
بس آئے روز کے چالان بھتے سے بچا دیجیے
مرے روزی کے اڈے کو ذرا پکا کرا دیجیے

بڑے صاحب! نہیں میں آپ سے اُجرت نہیں لوں گا
بس آئندہ میرے لائق کبھی کچھ کام نکلے تو، یہیں تشریف لائیے گا
بڑے صاحب!

میرے بچے کے سکول کا ترانہ

یہ دنیا میری دنیا ہے
میں اِس دنیا کا وارث ہوں
یہ دنیا میری دنیا ہے
اِس دھرتی کی ساری خوشیاں اور سارے مصائب میرے ہیں
سب روشن روشن تہذیبیں، آثار و مذاہب میرے ہیں
اِس دھرتی پر رہنے والے سب لوگ مرے ماں جائے ہیں
اور لاکھوں نوری سالوں پر، سیارو ثوابت سے آگے، گر ہیں تو مرے ہمسائے ہیں

ہر لمحہ جو تقویم سے باہر ہے اب اُس کی ہر ممکن ترمیم سے آگے جانا ہے
اِجماع کی ہر صورت کے لیے
تفریق سے آگے جانا ہے، تقسیم سے آگے جانا ہے
تاریخ مرا زورِ بازو، تعلیم اُجالا اور خوشبو
تحصیلِ ہنر میرا مقصد
میں دانش جُو، میں دانش جُو

یہ دنیا میری دنیا ہے، میں اس دنیا کا وارث ہوں

میں نے جب دنیا کو دیکھا

میں نے جب دنیا کو دیکھا
یہ ایسی اور ایسی تھی
تم جب دنیا کو دیکھو گے شائد ایسی یا ایسی ہو
اِس دنیا سے اُس دنیا تک ایک لکیر سے کی ہے
جو سیدھی چلتی جاتی ہے

ٹھیک سے میں بھی جان نہ پایا، کتنے یگوں کے بعد میں آیا
اور ہمارے بیچ میں کتنی صدیوں کا پھیلاؤ ہے
اِس بے انت سمے کے ساگر کی کتنی گہرائی ہے
اِک مُسکان مسافت ہے یا جگ جگ آبلہ پائی ہے
اَوجِ ثریا پر جو تم کو حکمت آج نظر آتی ہے
شائد کل کو عام سے لوگوں کے سمجھانے اور سمجھنے تک رہ جائے
سونا مٹی بن جائے گا یہ ایسا ہی لکھا ہے
پر کاش! تمہارے دل پر اُترے بھید سمے کا..............لمحہ لمحہ

آؤ تاریخ پھر سے مرتب کریں

جو ازل تا ابد کا احاطہ کرے
جس کے اوراق پر سچ کا جوہر کھلے
جس کے الفاظ میں روشنائی ملے
جس پہ اپنوں کا ایمان و ایقان ہو اور اغیار میں مستند جو رہے
آؤ تاریخ پھر سے مرتب کریں

آؤ تاریخ پھر سے مرتب کریں
جو فقط بادشاہوں کے جاہ و حشم، سیم و زر کے خزائن، جواہر حرم،
شاہزادوں کے نام و نسب کے بیاں اور جنگ و جدل سے عبارت نہ ہو
جس میں اہلِ حَکَم کی ستائش نہ ہو
جس میں اسلاف کی لن ترانی نہ ہو، اور زخموں کی بے جا نمائش نہ ہو
صرف روشن روایات کی تتلیاں
لے کے ساری رواداریوں کی مہک، اپنے آثار کے آئینوں سے اُڑیں
گُلعذاروں پہ خوشبو نچھاور کریں، لوک ورثے کے دستِ ہنر پہ کھلیں

آؤ تاریخ سچ کی بنا پر لکھیں
جس میں دانشوروں، شاعروں، بُت گروں،
اہلِ فن کے کمالات کے سب نشاں
عام لوگوں کے دکھ درد کی داستاں
اپنی دھرتی کے رنگوں کی قوسِ قُزح، آسمانی عقائد کی نیرنگیاں
قریہ قریہ کھلے موتیا اور گلاب، آنگن آنگن کھلی رات کی رانیاں
پڑھنے والوں کو پہلو بہ پہلو ملیں

سب مکاتب، کشادہ محاریب پر با حُروفِ جَلی یہ دعا بھی لکھیں

فن کی دیوی کہیں دان درشن کرے، ہم بدستور اُس کے پُجاری رہیں
زندہ لوگوں سے برگد کی چھاؤں ملے
روشنی کے منابع مزارات سے فیض کے سلسلے جاری ساری رہیں
لوک دانش سے آراستہ میکدے، اِک نئے عہد نامے کی بنیاد ہوں
سرد آتش کدے پھر سے آباد ہوں
سب محبت کے داعی معلم بنیں
مدرسے تارہ تارہ چمکتے رہیں
اپنی تاریخ کی مہرباں گود میں، میرے بچے ہمیشہ ہُمکتے رہیں
آؤ تاریخ پھر سے مرتب کریں
آؤ تاریخ سچ کی بنا پر لکھیں
جو ازل تا ابد کا احاطہ کرے

حصارِ ذات سے باہر نکل کر

حصارِ ذات سے باہر نکل کر
شُمارِ روز و شب سے ماورا ہو کر
اور اپنے چار سُو آلام سے صرفِ نظر کر کے
کسی فرصت کے عالم میں
تمہارے رس بھرے لہجے، تمہاری شوخ باتوں پر
تمہاری صندلیں بانہوں، سنہرے شبنمی گالوں، حیا آلود پلکوں پر
تمہارے ساتھ گزرے وقت کی پرواز۔ دن بھر کی مسافت پر
کسی خوابیدہ شیرینی، کسی جاگی ملاحت پر
کسی منہ زور دریا کے بہاؤ پر، کسی کاغذ کی ناؤ پر
کہیں خوشبو کے سائے میں، گُلِ رُخ کی تمازت میں
کسی سرشار ساعت میں
مجھے اِک نظم لکھنا ہے

Overseas Call

کتنے ہی زمانے بیت گئے......
اِک نرم ملائم کومل سی آواز نے شیریں لہجے میں
کل شام اچانک مجھ سے کہا
"تم کیسے ہو؟"

میں اپنی دشت نوردی کی سب آبلہ پائی بھول گیا
اُس خوابِ خیال کے پیکر تک، میں اپنی رسائی بھول گیا
کتنے ہی زمانے بیت گئے......

Weekend Evening

چلو اُترو کہ مغرب ہو رہی ہے
مِنی بس میں ٹھنسی مخلوق میں پیوست ہو کر نسبتاً محفوظ ہو جاؤ
کہ اگلے چوک پر ناکہ لگا ہے

ذرا احتیاط ہی رہنا
محلے کے ہر اک چھوٹے بڑے کی عیب جُو نظروں سے بچنے کے لیے
جلدی سے گھر پہنچو
کہیں ایسا نہ ہو
اِس ڈوبتے سورج کی کرنوں سے تمہارا نُقرئی زرتار پیراہن سلگ اٹھے
کوئی میلی نظر چمکے، کسی اندیشہ موہوم سے احساس کا دامن سُلگ اٹھے
چلو جلدی سے گھر پہنچو اور اپنے گھر میں کہہ دینا
کہ پھر اگلے سنیچر کو، یہ ممکن ہے، تمہیں کچھ دیر ہو جائے
یہ کچھ ٹوٹے ہوئے پیسے کرائے کے لیے رکھ لو
چلو اُترو

مجبوریت *

سُنو اے خوبصورت اجنبی
تم دو دلوں کے درمیاں مذہب کو کیوں لائے
چلو میں مان لیتی ہوں تمہارا دین سچا ہے
مرے جذبات بھی جھوٹے نہیں

چلو اِس بحث کو چھوڑو
مجھے تم اور بھی اچھے لگے جب سے سُنا میں نے

تمہارے لوگ اپنی عام سی قبروں کو بھی آباد رکھتے ہیں
مگر یونہی خیال آیا کہ کل تم لوٹ جاؤ گے
تمہارے چاہنے والے تمہارے خیریت سے لوٹ آنے پر
تمہیں کس رس بھرے لہجے میں ڈانٹیں گے، نظر کیسے اتاریں گے
تمہیں کس نام سے، کیسے پکاریں گے

ذرا اُس وقت کا سوچو
ہمارے آنگنوں سے چاندنی جب روٹھ جائے گی
منڈیروں پر کوئی کاگا نہ بولے گا
کوئی صد برگ اپنا دل نہ کھولے گا
ہوا میں برف کی سی کاٹ ہوگی
دھوپ میں اتنی تمازت بھی نہیں ہوگی
تمہیں دشوار رستوں پر نکلنے کی اجازت بھی نہیں ہوگی
مگر اخروٹ یونہی وقت پر پکتے رہیں گے
اور جنہیں اگلے جہانوں کا تجسس ہے، شجر ممنوعہ بھی چکھتے رہیں گے

جو ہونی ہے وہ ہو کر ہی رہے گی اور یہی تقدیر ہے شاید
کہ میرے سامنے میری ثقافت بھی ابھی تبدیل ہونی ہے

نئے رستے نکلنے ہیں، مجھے تسلیم کرنا ہے، ہر اک ارشاد کی تعمیل ہونی ہے

چلو یونہی سہی لیکن ہمارے بس میں بھی کیا ہے
مگر اِک کام تو کرنا
کسی ویران گاؤں کے، کسی خاموش رستے پر، کبھی تم سیر کو نکلو
کسی برگد کے سائے میں، گھڑی بھر کے لیے بیٹھو
اور اِس وادی کی سب یادیں دبے پاؤں چلی آئیں
تم اپنے حال سے صرفِ نظر کر کے
ذرا سا مسکرا دینا
اور اپنی مسکراہٹ کو ستاروں سے سرِ آکاش لکھ دینا
مری تسکین کی خاطر
کسی پتھر کے کتبے پر، مرا کالاش لکھ دینا
سنو اے خوبصورت اجنبی!

* کالاش: تین وادیوں بمبوریت، رمبور اور بریر کے مجموعے کا نام ہے اور ان میں بمبوریت سب سے بڑی وادی ہے

”سلامِ ماہرِ سانید“

رَس اور لَے کاری کے جوہر
رنگی خاں اور بسم اللہ کو سنتے ہوئے
رتحل، ریت، رواج، رچاؤ سے ہوئے سرشار
ایک مقدس کنجِ عزلت کے درشن کو ٹھٹھہ قادر شاہ گئے
میں اور فرخ یار!

مرے ابنِ بطوطہ۔ تم کہاں ہو
(ملک فرخ یار کیلئے)

مرے ابنِ بطوطہ
گاؤں کی کلّر زمینوں میں پھلاہی اِس برس بھی بُور سے خالی رہی ہے
مرے ابنِ بطوطہ
گاؤں کے باہر فقط شورہ زدہ قبروں کے پہرے دار کیکر زرد چادر اوڑھ کر
گُم صُم کھڑے ہیں

مرے ابنِ بطوطہ! گاؤں کے برگد کا وہ بھاری خمیدہ ڈال
(جس پر ایک جھولا، جو ہماری یاد سے پہلے کا تھا)
پچھلے برس کی آندھیوں میں گر گیا ہے
مرے ابنِ بطوطہ! گاؤں کے سب آنگنوں سے رات کی رانی کی افسردہ سی
خوشبو اب نہیں آتی

کوئی صد برگ تو ڈھونڈے نہیں ملتا
گُلِ عباس بھی ناپید ہوتا جا رہا ہے اور ہر اک موتیا جُھلسا پڑا ہے

مرے ابنِ بطوطہ! گاؤں کے ہر ایک چہرے پر فقط حیرانیاں ہیں
اور فضا میں صرف خاموشی رچی ہے
گاؤں کے سارے مویشی بک گئے ہیں اور اُن کی گھنٹیاں چوپال سے
ملحق بڑے چھپر کے اِک شہتیر پر لٹکی ہوئی ہیں
مہاجن کے گھروں سے جھانکتی آسودہ حالی قصۂ پارینہ بنتی جا رہی ہے
اور اُس نے اپنے بیٹوں کو دیارِ غیر میں روزی کمانے بھیج رکھا ہے
مرے ابنِ بطوطہ! گاؤں کے پنگھٹ پہ خودرَو دُوٹیوں کا راج ہے
دو دو گھڑے سر پر اٹھانے والیاں مدقوق چہرے آئینوں سے بھی چھپاتی ہیں

مرے ابنِ بطوطہ! گاؤں کی بیری سے کچے بیر گرتے جا رہے ہیں

اور اس بیری کی اک سوکھی ہوئی سی شاخ پر تنہا کٹاری،
صبح سے خاموش بیٹھی ہے

سُنا ہے اب ہماری اور پڑوسی گاؤں کی بنجر اراضی پر
بنا پوچھے، کسی تعمیر کی بنیاد رکھی جا رہی ہے
پھر ہمیں کچھ دے دلا کے اشک شُوئی کی خبر ہے
اور مفادِ عام کی لوری سنائی جا رہی ہے
مرے ابنِ بطوطہ۔ تم کہاں ہو؟

اَے اُوشا

پاری جاتا کے پھولوں کے گجرے نہ مٹی میں رول
میں اِس عہد کا شاعر ہوں
اَے اُوشا! میرے سامنے آ اور اپنا سینہ کھول

تیرے رسیلے ہونٹوں پر کھِلنے والے سب شبدوں میرا ایمان
زندہ رہنے والی نظمیں تیری سُندرتا کا دان
لیکن میری اُوشا سُن،
تجھ کو دیکھنے والے سارے آئینے بے نور نہیں
پاری جاتا کے پھولوں کے گجرے نہ مٹی میں رول
میں اِس عہد کا شاعر ہوں
اَے اُوشا!
میرے سامنے آ اور اپنا سینہ کھول

کرشن کرورَ

گوری تیرے سینے پر امرت کے دونوں چشمے
جانے کب سے خشک پڑے ہیں
اور سمے کا زہر ہمارے نیل و نیل اجسام کے اندر
اپنی گردش بھول چکا ہے
گوری اب ہم کس کو پکاریں
گوری تیرے سینے پر امرت کے دونوں چشمے
جانے کب سے خشک پڑے ہیں

پہلی عورت سَت رُوپا تھی

پہلی عورت سَت رُوپا تھی (جس کے سو سو رُوپ)
دوسری عورت تم ہو جس نے
قوسِ قُزح کے رنگوں کی تکسید سے ایک سفید لباس تراشا
اور پھر اس میں اپنے سونے کی تاروں سے رشتۂ جاں کو باندھا ہے

سُندر گوری۔ مُکتا کیشی!
اِس منظر کے بعد اگر اب چشمِ تماشا سے بینائی جاتی ہے تو جانے دو

......زمانہ کب دیکھے گا؟

تُو وہ بیل، کہ جس پہ سِرس کے پھولوں سے بھی نازک کلیاں
تیرے جاگنے سے پہلے ہر صبح ترا ملبوس بنیں
میں وہ اشوکا پیڑ کہ جس پر گھورے کی گرد جمی ہے
اور اِس گرد کی موٹی تہہ کو
تیرے دودھیا، نرم ملائم، کومل پاؤں کے لمس نے جانے،
کس تقویم کی، کون سی شُبھ مُہورت میں، نامُوصل سے مُوصل کرنا ہے

سب معلوم عناصر اپنی روشنی تجھ سے لیتے ہیں
مجھ پر کھلنے والے آتشی پھول زمانہ کب دیکھے گا؟

پوٹھوہار

کٹا پھٹا، پتھریلا سا
بانکا، چھیل چھبیلا سا
صدیوں کی اِس راہ گزر پر کھلتی سرسوں کی مہکار
پوٹھوہار

تو اک ایسا برگد ہے کہ ہر اک رِشی مُنی اور سادھو نے پایا تُجھ سے نروان
رانجھا لے گیا جوگ یہاں سے، میاں محمد بخش عرفان *
تیری کشادہ چوکھٹ کے ہر اک سائل کو دیتے جائیں مہر و وفا کے بھر بھر جام
گرودوارہ پنجہ صاحب، مہر علی اور بری امام

تیری چاہ میں باتیں مہکے
سید ضمیر حسین بھی چہکے اور وہاں سُلگے گلزار
پوٹھوہار

تیرے نوحہ گروں میں کون
اُجڑا اُجڑا سا پھروآلہ ** اپنے آپ میں گُم رہتا ہے
راجہ کوثر، فرخ یار، چوآ سیدن شاہ، کٹاس
تیری سُونی مانگ کے تارے
تیرے جھومر، جھمکے، ہار
لانس نائیک محمد محفوظ ***
کیپٹن سرور، میجر اکرم اور حسین شہید سوار
پوٹھوہار

---

* ''عرفان'' میں 'ع' کا اعلان نہیں ہوتا لیکن ضرورت شعری کے تحت اسے قائم رکھا گیا ہے۔
** قلعہ پھروآلہ گکھڑ سلطان سارنگ کا صدر مقام، راولپنڈی سے کہوٹہ جانے والی سڑک پر تقریباً 25 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔
*** لانس نائیک محمد محفوظ، کیپٹن راجہ محمد سرور، میجر محمد اکرم اور سوار محمد حسین۔ ان چاروں ''نشانِ حیدر'' کا اعزاز پانے والے شہدا کا تعلق راولپنڈی / پوٹھوہار سے ہے۔ تحریر کے اب تک نشانِ حیدر پانے والے دس شہداء میں سب سے زیادہ تعداد یعنی چار ضلع راولپنڈی سے تعلق رکھتی ہے۔

کابل

اُس شہر کا نوحہ کیا لکھوں
جو ہمسرِ ہفت افلاک ہوا، جس کا دامن صد چاک ہوا
جس کی تسخیر کے پاگل پن میں
سترہ لاکھ نفوس کا خونِ ناحق رزقِ خاک ہوا

اب کون شُمار میں لائے گا
کتنے بے گور و کفن لاشے، کتنے بے کس لاچار مہاجر، کون شمار میں لائے گا

تہذیب کے سارے مظاہر سے اللہ کے نام کا بیر جسے
چھو کر نہ گزرا خیر جسے
یہ جُہلِ مرکب تھا جس نے، کتنے ہی دستِ خود دخا دریوزہ گری میں جھونک دیئے

اِک نانِ شبینہ جس کا عوض، اِک ارزاں فحبہ کیا لکھوں

زخموں کا مداوا کیا لکھوں
کچھ بھی تو نظر سے اوجھل ہو، اے دیدۂ بینا! کیا لکھوں
اُس شہر کا نوحہ کیا لکھوں

شمشیر و سناں کی دوڑ میں کوسوں پیچھے رہ جانے والوں کا ذکر ہی کیا
اِک عمر پڑی ہے، طے کر لیں گے
ہنستے بستے شہر کی روشن گلیوں میں کس کس نے آگ لگائی تھی
پر یہ لاریب حقیقت ہے، سب اندر باہر والوں نے
اپنے مقدور سے بڑھ کر بھی اِس آگ کو روشن رکھا ہے
اُس شہر کا نوحہ کیا لکھوں

کوئی نہیں

تجھ سے نکلی ہر کرن قوسِ قزح
ہر قوس میں لاکھوں قرینے
ہر قرینہ اِک طلسمِ کشفِ ذات

ہر غلط بخشی ترا حقِ مقدم ہی سہی
پر قدِ آدم آئینے میں خود کو دیکھ اور پھر بتا
کیا تیرے شاعر کے علاوہ بھی سزاوارِ تجلی ہے کوئی؟
کوئی نہیں

دیوی کیا تُو جاگ رہی ہے

مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے
جیسے کوئی دستِ مصور، تیرے رسیلے ہونٹوں پر
اِک سُندر سی مُسکان سجا کر پھول کِھلانا بھول گیا ہے

مجھ کو ایسا کیوں لگتا ہے
تیرے بھرے بھرے سینے پر، مرمل لہروں کی ترتیب سے وقت مدوّر نقش بنا کر
اِن کو جھلانا بھول گیا ہے

شاید ایسا ہی ہونا تھا
شاید ایسا ہی لکھا تھا
لیکن کیا تُو جانتی ہے کہ تیرے پُجاری
تجھ کو طاقِ عقیدت میں رکھنے کے بعد اب لمبی تان کے سوئے پڑے ہیں

اور یہ تیرا شاعر دیوی
اپنی نُمرتا میں ڈوبی، کچھ کومل نظمیں لے کر
پَو پھٹنے کے ایک مُہورت سے کچھ پہلے
تیرے بند جھروکے پر، تاروں کی جھلمل دیکھ رہا ہے

دیوی کیا تُو جاگ رہی ہے

چلو پھر سے کہو
(ریحانہ قمر کیلئے)

تمہیں یہ زیب دیتا ہے، تمہارا دفعتاً کہنا
"میں کتنی خوبصورت ہوں"
میں کہتا ہوں کہ وہ جو خوبصورت ہے
تمہارے رُوئے گُل کو دیر تک شاداب رکھے گا
تمہیں اِذنِ سخن دے کر
تمہارے شبنمی لہجے میں کو ملتا رچائے گا
مہکتی ریشمی پوروں کے تابع حرف و معنی کے سبھی مہتاب رکھے گا
وہی جو خوبصورت ہے

وہی جو خوبصورت ہے
اگر تارِ رگِ جاں ایک پل میں دو سو اِکسٹھ بار دھڑکائے، شرُوج قائم کرے
اور پھر جسے چاہے
اقالیمِ مشیت کی شہنشاہی عطا کر دے
کہ مشکوٰۃِ ظواہر میں اُسی کی روشنائی ہے
وہی جو خوبصورت ہے
مگر تم بھی کہو، ''میں خوبصورت ہوں''
چلو پھر سے کہو، ''میں خوبصورت ہوں''

کہیں فرحتؔ نے لکھا ہے

کہیں فرحتؔ* نے لکھا ہے
''کبھی مرگِ محبت** کا سبب کچھ بھی نہیں ہوتا''
زمانی اور مکانی قُرب کی سرشاریاں بھی لمحہ موجود سے آگے نہیں جاتیں

کہاں تم ہو کہاں میں ہوں خبر کچھ بھی نہیں لیکن یہی سچ ہے
کہ ہم اپنے دوائر میں، طلسم اندر طلسم انوار سے آگے کشیدہ خطِ حیرت پار
کرنے کی سعادت سے یقینی طور پر محروم ٹھہرے ہیں

ہمارے پاس ہر اِک بات کے سو سو دلائل ہیں
عدیم الفرصتی، کارِ جہاں، گھر بار اور دیگر مسائل ہیں
سو ہم مظلوم ٹھہرے ہیں
مگر یہ نظمِ عالم کب ہماری خواہشوں کے رُخ پہ چلتا ہے

کہیں فرحتؔ نے لکھا ہے
کبھی ہم کو یقیں تھا
صبح کی پہلی کرن تو بس ہماری جنبشِ ابرو کی تابع ہے
ہمارے گھر کے آنگن میں کھلے پھولوں کی رنگت سے دھنک ترتیب لیتی ہے
پرندے بس ہمارے دیکھنے سے چہچہاتے ہیں
ہماری ہم نشینی میں ستارے کھلکھلاتے ہیں
ہمارے گنبد و محراب کے قوسین سے تاریخ اپنا مان لیتی ہے
ہمارے برگدوں سے زندگی آبِ بقا کا دان لیتی ہے
ہماری اِک نظر سے چاند کا ہالہ بدلتا ہے
ہماری بے رُخی سے چہرۂ خورشید جلتا ہے
مگر یہ نظمِ عالم کب ہماری خواہشوں کے رُخ پہ چلتا ہے

نگارِ زیست کی ساری شعاعیں قریۂ موعود سے آگے نہیں جاتیں

زمانی اور مکانی قرب کی سرشاریاں بھی لمحۂ موجود سے آگے نہیں جاتیں
دیارِ حرف کے طاقوں پہ کھلتی روشنائی بھی حقیقت ہے
ہماری دسترس یا نارسائی بھی حقیقت ہے
طلوعِ مہر سے پہلے کوئی تارہ بھی کافی ہے
مگر سب کچھ اضافی ہے
کہیں فرحتؔ نے لکھا ہے

* معروف افسانہ نگار محترمہ فرحت پروین جن کے تین افسانوی مجموعے "منجمد"، "ریستوران کی کھڑکی سے"، "کانچ کی چھاں" شائع ہو چکے ہیں۔
** "مرگِ محبت" فرحت پروین کا افسانہ "ریستوران کی کھڑکی سے" میں شامل ہے۔

پروین سلطانہ کے لیے ایک نظم

تمہیں کس نے کہا بزمِ سخن اصحابِ دل سے خالی ہوتی جا رہی ہے
ادھر دیکھو!
یہاں! وارفتگی میں مسندِ ارشاد سے نیچے اُتر کر کون آیا ہے
محمد خالدؔ آیا ہے
جلوے خاص میں جس کے علی زریونؔ ہے، اختر علی، عمادؔ اظہر ہے
شناورؔ بھی ہے بابرؔ بھی ہے اور ناچیز کوثرؔ بھی
نہ جانے اور کتنے چاہنے والے، سراپا عجز بن کر گوش بر آواز بیٹھے ہیں
چلو پروین سلطانہ شروع قائم کرو

ازل کی وسعتوں میں یہ طلسم اندر طلسم آواز
جیسے نورِ اولیٰ۔ لامکاں کی سرحدوں کے پار، ہر لحظہ فزوں تر ضوفشانی میں
رچاؤ غیر فانی ہے تمہاری سُر کہانی میں
سلیقہ رس میں ڈھلتا ہے تمہاری ترجمانی میں

تمہارے سُر کی پہنائی
کسی بھی حدِ امکاں سے ورا کی وسعتوں سے آشنائی دے
تمہاری آخری سپتک پہ سرگم۔ نغمۂ داؤد کا پرتو دکھائی دے
تمہارے اِرتفاعِ خاص کو تسلیم کرنا آج کا دستور ٹھہرا ہے
کہ تم سُر تال کے دربار میں کتنی سہولت سے حکومت کر رہی ہو
جبکہ واں تختِ سلیماں آخری صف میں کھڑے لوگوں کے پاؤں چوم کر
مسرور ٹھہرا ہے

تمہیں تعظیم دینا آج کا دستور ٹھہرا ہے
چلو پروین سلطانہ شروع قائم کرو

سید پور

بری امام کے مغرب میں
خوبانی اور لوکاٹ کے سوکھے پیڑوں میں سے جھانکتی سی
اور اپنی شکستہ حالی پر نادم نادم ۔ یہ سیدا خان کی بستی ہے
اور اس بستی کے اُجڑے مندر کی ٹوٹی ہوئی سیڑھیوں پر
کچھ اُجلے اُجلے نام ہمارے خوابیدہ اذہان پہ دستک دیتے ہیں

لالہ کرپا رام! تمہارے مندر کی بنیادوں سے اٹھکیلیاں کرتے موتیوں جیسے
بہتے پانی کی ٹھنڈک اور شیرینی اب صرف کتابوں میں ملتی ہے
اب تو بس اِس خشک ندی میں صرف تعفن بہتا ہے

بھائی سیوا سنگھ! تمہاری راولپنڈی کے مالک اب اور سے اور ہوئے
جاتے ہیں لیکن وارث کوئی نہیں ہے
اب تو تمہارے سارے پرانے چوباروں کے چوبی جھروکے،
لایعنی تعمیر کی خاطر ایندھن بنتے جاتے ہیں

بابو پرتھمی چند! تمہارا رسم الخط اپنے ہی جنم استھان میں کومل ریشمی پوروں
سے بنتے ہر نقشِ تحیر کو ترسا ہے

سُندر دیوی، مایا دیوی! تم نے جہاں بھیگی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں سے اپنے
گل ہائے عقیدت ثبت کیے تھے
آج وہاں مکتب کے بچوں کا بے ہنگم شور سنائی دیتا ہے

لالہ لکھومل سوری جی! جس چمکیلے شہر کی آبادی میں ہمارے پُرکھوں کی سب
قبریں بھی مسمار ہوئی ہیں
اُس نے تمہارے چاروں کنڈ اور چشموں کا تاوان لیا ہے
اُس جانب بھی یہی ہوا ہے
لیکن لالہ! ہم تو بڑے خسارے میں ہیں
اب تو ہمارے پاس لپٹ کر رونے کو دیوار نہیں ہے

فصلِ اول

۱۹۸۰ء ـ ۱۹۹۶ء

اب ذرا تفصیل سے اے قاصدِ خوش رَو بتا
اُس نے پہلے کیا کہا، پھر کیا کہا، پھر کیا کہا

امن اور تہذیب کی بن کے پیمبر، تتلیاں
کیوں چلی ہیں ایک بے پایاں سفر پر تتلیاں

اِن کو اندازہ نہیں ہے پاؤں بھی جل جائیں گے
چلچلاتی دھوپ میں نکلی ہیں باہر تتلیاں

وقت سے پہلے ہی کھو دیتی ہیں اپنی دلکشی
کھردرے سے بُوالہوس ہاتھوں میں آ کر تتلیاں

پھول شیشے کے گھروں میں اِس لیے رکھے گئے
روئیں نا محسوس دیواروں سے لگ کر تتلیاں

مانگ بھی سکتی نہیں خود اپنے رنگوں کا حساب
فطرتاً خاموش سی ہوتی ہیں کوثرؔ تتلیاں

لے گئی بے مہر آندھی سب اُڑا کر تتلیاں
اب کہاں بے برگ و گُل بستی میں سُندر تتلیاں

آندھیاں شاید کسی پھُولوں کی وادی میں چلیں
ساتھ اپنے لائی ہے ندی بہا کر تتلیاں

جسم رنگوں کی دھنک اور لمس خوشبو کا سفر
چُپ میں ساحل اور شوخی میں سمندر تتلیاں

سوچ کے آئینوں پر تابندہ رہتے ہیں سدا
اُنگلیوں پر چھوڑ جاتی ہیں جو پیکر تتلیاں

جب ہوائیں شہر کی مسموم ہوں تو شہر سے
رفتہ رفتہ کوچ کر جاتی ہیں کوثرؔ تتلیاں

صبحِ وصال اور شامِ جدائی کے سب منظر بھول گیا ہے
ٹوٹے گجرے، پھیلا کاجل، اُلجھا جھومر بھول گیا ہے

اور اُسے کچھ یاد رہے گا یہ تو بس اِک خوش فہمی ہے
جلتے آتش دان پہ موم کی گڑیا رکھ کر بھول گیا ہے

دریا کے اُس پار اُترنے کی خواہش مُنہ زور تھی ایسی
اپنی کاغذ کی کشتی، دریا کے تیور بھول گیا ہے

شیشے کی دیوار تو خوشبو اور تتلی کو روک سکے گی
شیش محل کی جانب آنے والا پتھر بھول گیا ہے

تیز ہوا بھی گھر سے باہر گھات لگائے بیٹھی ہے
اور وہ اپنا تتلی جیسا نازک پیکر بھول گیا ہے

کوئی کرن رستہ دکھلائے کوئی مہک رہبر بن جائے
کوئی جگنو اپنے گھر کا رستہ کوثرؔ بھول گیا ہے

شہرِ تمنا پر یہ کیسا دُکھ کا بادل پھیل گیا
ہنستے ہنستے برکھا برسی، آنکھ میں کاجل پھیل گیا

کتنی شوخ دھنک سی یادیں، چاندنی میں ڈھل جائیں گی
دن کا رُوپہلا جھومر اُترا، رات کا آنچل پھیل گیا

دریا، جھیل، سمندر، آنکھیں اور ترستا شبنم کو
تشنہ لبی کی بات چلی پھر پیاس کا جنگل پھیل گیا

کتنے برس کا ساتھ سنہرے خوابوں کا اِک لمحہ تھا
کتنے زمانوں پر تنہائی کا ہر اِک پل پھیل گیا

پھر وہ پیکرِ خوشبو کوثرؔ سوچ کے آئینے سے اُڑا
پھر احساس بہاروں جیسا کومل کومل پھیل گیا

ہر آئینے سے خراجِ جمال لیتا ہے
وہ دل سے دھڑکنیں دل کی نکال لیتا ہے

وہ موج موج سے اوجِ کمال لیتا ہے
کرن کرن سے وہ قوسِ خیال لیتا ہے

وہ جذب کرتا ہے خوش رنگ تتلیوں کا وجود
گُلوں سے کھلتے ہوئے خدوخال لیتا ہے

بکھرنے دیتا نہیں وہ طلسمِ شہرِ سُخن
خطوط سارے بدن کے سنبھال لیتا ہے

یہ معجزہ بھی خصوصی نصیب ہے اُس کا
حروفِ سادہ میں شیرینی ڈال لیتا ہے

سُروں سے کرتا ہے کوثر کشید کو ملتا
ہر ایک لَے کو وہ سانچے میں ڈھال لیتا ہے

ق

طلوعِ مہر سے ہر روز فال لیتا ہے
بزعمِ خویش وُجوبِ وصال لیتا ہے

متاعِ فکر بیک جنبشِ کنارۂ چشم
بصد غرور وہ شیریں مقال لیتا ہے

ترے آئینۂ رُخ پر کوئی عکسِ کمال آئے، تجھے میرا خیال آئے
حدیثِ دیگراں میں جب مقامِ اِتصال آئے، تجھے میرا خیال آئے

کسی صورت، جراحت ہائے دل کا اِندمال آئے، تجھے میرا خیال آئے
ندیمِ خوش خِصال آئے، عروسِ پُر جمال آئے، تجھے میرا خیال آئے

کہیں جب رات کی رانی کھِلے، جب برشگال آئے، تجھے میرا خیال آئے
کہیں کوئل کی کُوکُو کُو، مرے شیریں مقال آئے، تجھے میرا خیال آئے

ترے ہونٹوں کی شیرینی، اُلوہی مسکراہٹ میں، ترے الفاظ کے رس میں
ترے لہجے کی شبنم میں، کوئی رنگِ جمال آئے، تجھے میرا خیال آئے

ترے اِس مرمریں پیکر سے جب قوسِ قزح نکلے، ستارے راستہ بھولیں
تری خوشبو کے پیچھے کوئی رَم خُوردہ غزال آئے، تجھے میرا خیال آئے

تری اِک جنبشِ لب کے مقابل آئینے ٹوٹیں، ہر اِک جانب کھِلیں کلیاں
ترے ظلمِ جہاں پہ جب بھی اوجِ لازوال آئے، تجھے میرا خیال

طلب میری، عطا تیری، من وتُو کے مراحل سے کہیں آگے کی ہے کوثرؔ
نگاہِ غیر میں کیونکر مرا دستِ سوال آئے، تجھے میرا خیال آئے

اگر آنکھوں میں کوئی خواب سا در آنے لگتا ہے
کسی اندیشۂ موہوم سے ڈر آنے لگتا ہے

یہ کیسی چاندنی ویران آنکھوں میں اُترتی ہے
اندھیرا سا پسِ اشکِ مُنوّر آنے لگتا ہے

اُسے اچھا نہیں لگتا اگر بے خانماں رہنا
وہ رستہ کیوں بدل لیتا ہے جب گھر آنے لگتا ہے

فصیلِ جسم و جاں پر خامشی جب رقص کرتی ہے
غنیمِ شہر کا سا شور اندر آنے لگتا ہے

تکلّم کے سبھی پیکر خموشی اوڑھ لیتے ہیں
جب اُس کے لب پہ میرا نام کوثرؔ آنے لگتا ہے

سِتارہ سا کوئی بامِ فلک پر آنے لگتا ہے
مری جانب مرا فرخ قدم گر آنے لگتا ہے

اُسے آہستگی سے دُور لے جاتی ہیں کچھ لہریں
کنارِ آب جُو جب رُوئے خاور آنے لگتا ہے

اُداسی اور خوشی کا ہر سفر پہلو بہ پہلو ہے
مگر ہیں دائرے ایسے کہ چکر آنے لگتا ہے

کئی خوابیدہ شمعیں پھر سے جل اُٹھتی ہیں راتوں میں
مری تقویم میں جب بھی دسمبر آنے لگتا ہے

ضروری کام کتنے ہی نکل آتے ہیں کوثر جب
فراغت کا کوئی لمحہ میسر آنے لگتا ہے

ہر روز مجھے خط لکھتی تھی
وہ کتنی اچھی لڑکی تھی

پھولوں جیسی کومل کومل
پاکیزہ شبنم جیسی تھی

کیا نرم ملائم لہجہ تھا
اور باتوں میں شیرینی تھی

اِک رُوح میں بسنے والی مہک
اُس کی ہر پور سے اُٹھتی تھی

اِک نور تھا اُس کے چہرے پر
آنکھوں میں حیا کی لالی تھی

بے ساختہ پیار آ جاتا تھا
کیا صورت بھولی بھالی تھی

وہ میرے سونے آنگن میں
اِک رات کی رانی لگتی تھی

❋

چپ چاپ کبھی جب ہوتی تھی
اِک کانچ کی گڑیا لگتی تھی

ہر دل میں گھر کر لیتی تھی
وہ خوش اطوار ہی ایسی تھی

وہ ہر پہلو سے دلکش تھی
اور کتنی سلجھی سلجھی تھی

اُس کی اُردو بس ایسی تھی
انگریزی اچھی لکھتی تھی

اُس کی ہر ایک نصیحت بھی
اِک حکم کا درجہ رکھتی تھی

وہ میرے گھر کے زینے پر
اِک چاندنی بن کر اتری تھی

❋

وہ ایک خوشی جو سچی تھی
اُس کے ملنے سے ملتی تھی

وہ میرے ہاں جب آتی تھی
اِک رونق سی لگ جاتی تھی

اِس دل کے خالی رستوں پر
جب اُس کی چاپ اُبھرتی تھی

من پھولوں سے بھر جاتا تھا
ہر ایک روش کِھل اُٹھتی تھی

جب اُس کو صبا چھو جاتی تھی
رم جھم سی ہونے لگتی تھی

جس راہ سے بھی وہ گزرتی تھی
تا دیر وہ روشن رہتی تھی

سب خوشیاں رقص میں رہتی تھیں
وہ جتنی دیر ٹھہرتی تھی

اُس کے جانے کے بعد مگر
بے نام اُداسی رہتی تھی

جب آخری بار ملی تھی وہ
کچھ رنجیدہ سی لگتی تھی

الفاظ بھی کچھ کچھ اُجڑے تھے
آواز کھنک سے خالی تھی

لہجہ کچھ بدلا بدلا تھا
جیسے کوئی مجبوری تھی

اور دستِ حنائی میں اُس کے
اِک ہیرے کی انگوٹھی تھی

کیا کہنا تھا کیا سننا تھا
کیا دیر تھی اور کیا جلدی تھی

میں اِک معمولی شاعر تھا
وہ اونچے محلوں والی تھی

میں جیسے کوئی برگِ خزاں
وہ پھولوں کی اِک ڈالی تھی

اُس کا ہر روپ سنہرا تھا
میرے بالوں میں چاندی تھی

میرے اندر اِک صحرا تھا
اُس کے آگے اِک ندی تھی

اللہ اُسے خوش خوش رکھے
وہ جیسے خوش خوش رہتی تھی

ہر روز مجھے خط لکھتی تھی
وہ کتنی اچھی لڑکی تھی

دھوپ، شعلہ، شفق، چاندنی، روشنی
کتنے ناموں سے بانٹی گئی روشنی

شب گزیدوں کی آنکھوں میں تاریکیاں
اور خوابوں میں ہے روشنی روشنی

راہ دشوار اور پُرخطر تھی جہاں
میرے پہلو سے لگ کر چلی روشنی

دن چڑھا تو نہ جانے کہاں کھو گئی
میرے ہمراہ شب بھر رہی روشنی

آئینے کے مقابل ہوا چاند جب
عکس در عکس کھلتی گئی روشنی

میرے آنگن وہ مہتاب اُترا مگر
بام پر جانے کیوں رُک گئی روشنی

میرے مولیٰ تھکے ہارے لوگوں کو دے
شبنمی راستے، نقرئی روشنی

نسبتیں میری ساری تجھی سے رہیں
نظم خوشبو، غزل ہو مری روشنی

قریۂ جاں میں ہے اور بھی تیرگی
میرے نام اور لکھ آگہی، روشنی

حصارِ شب سے سحر کو رہائی کیا دیں گے
بجھے بجھے سے دیے روشنائی کیا دیں گے

ہمارے پاس سوا ظلمتوں کے کچھ بھی نہیں
عروسِ صبح کو ہم مُونہہ دکھائی کیا دیں گے

خلائے دہر میں بکھرے ہوئے کئی نغمے
سوائے گوشِ دل و جاں سُنائی کیا دیں گے

جو نفرتوں کی سیاہی کے ہیں اسیر اُنہیں
دیارِ نور کے رستے سجھائی کیا دیں گے

مثالِ نغمۂ برگِ خزاں ہیں ہم کوثرؔ
ہم آنے والی رُتوں کو سنائی کیا دیں گے

وہ دیکھنے میں تو لگتا تھا برف کا پیکر
ہوائے سرد میں کیسے پگھل گیا پیکر

کبھی احاطۂ ادراک میں نہیں آیا
کہ خوشبوؤں کو ملا ہے عجیب سا پیکر

ابھی ہیں تشنۂ تکمیل خدوخال اُس کے
ابھی کچھ اور ہے اُس کا تراشا پیکر

اے میرے دستِ تصور مجھے بتا تو سہی
اُس ایک شخص کے کتنے بنائے گا پیکر

ہے فرق جذبِ نظر کا سو اِس لئے کوثرؔ
ہر اِک نظر میں سمایا جُدا جُدا پیکر

وہ فصلِ گُل میں بھی بے برگ و بار رہتا ہے
کہ اُس کے گرد انا کا حصار رہتا ہے

رہِ خیال سے جب قافلے گذرتے ہیں
فضا میں دیر تلک اِک غبار رہتا ہے

تکلفاً بھی کوئی مسکرائے تو یہ دل
بہت دنوں کے لیے زیرِ بار رہتا ہے

مرے پڑوس کی بیلوں میں پھول آئے ہیں
سو میرا صحن بھی اب مشکبار رہتا ہے

تمام عمر رگِ جاں سے جو قریب رہا
وہ شخص آج بھی دریا کے پار رہتا ہے

کوئی بھی حادثہ گذرا نہیں مگر کوثرؔ
یہ دل بھی کیا ہے کہ بس سوگوار رہتا ہے

کیسے کیسے لبادے لیے بھیڑیئے
راہِ امن و وفا پر ملے بھیڑیئے

آج کے دور میں کون محفوظ ہے
ہیں تعاقب میں ہر ایک کے بھیڑیئے

کیوں ہمہ وقت رہتے ہیں پیشِ نظر
واہموں سے تراشے ہوئے بھیڑیئے

کتنے لوگ آ گئے دامِ تزویر میں
گوسفندوں کے قالب میں تھے بھیڑیئے

میرے بچوں پہ ہے ڈر کا آسیب سا
کب سے شہروں میں بھی آ گئے بھیڑیئے

امنِ عالم کا ہے مسئلہ سامنے
دائرے میں ہیں بیٹھے ہوئے بھیڑیئے

❁

اچانک منکشف مجھ پر ہوا ہے
جو در کب سے مقفل تھا، کھلا ہے

یہ کیا ہر خواب آتش زیرِ پا ہے
وگرنہ شہر پہلے بھی جلا ہے

ہوا ماتم کناں، بوجھل فضا ہے
کوئی دیوارِ گریہ سے لگا ہے

وہاں سورج پگھلتا جا رہا ہے
جہاں بہتا ہوا پانی جما ہے

سُبک رو ندیاں ساکن ہوئی ہیں
سمندر کس طرف کو چل پڑا ہے

❁

تجھے کس محویت سے دیکھتا ہے
یہاں اِک طفلِ مکتب سا کھڑا ہے

گُلِ رُخ جیسے شبنم سے دُھلا ہے
کنول سا جھیل میں تازہ کھِلا ہے

ابھی سے ڈھونڈنے جگنو چلا ہے
ابھی تو بام پر سورج کھڑا ہے

ابھی خوش رنگ تتلی اُڑ گئی ہے
اور اُس کا لمس پیچھے رہ گیا ہے

❁

ترے ہی رُوئے انور کی ضیاء ہے
مرے تاریک گھر میں اور کیا ہے

ہنر میرا تو مٹی کا دیا ہے
یقیناً روشنی تیری عطا ہے

فضا میں رُوپ کی چاندی گھلی ہے
اُجالا دُور تک پھیلا ہوا ہے

وہاں قوسِ قزح سی بن گئی ہے
جہاں کوثرؔ ترا سایہ پڑا ہے

❁

شجر سا کب سے صحرا میں کھڑا ہے
مخالف سمت کو سایہ چلا ہے

ہمیشہ بے تعلق ہی رہا ہے
مگر پھر بھی وہ کیوں اچھا لگا ہے

کنارے بھی کہاں تک ساتھ جائیں
کہ دریا تو مسلسل بہہ رہا ہے

❁

بھلے سے اجنبی یا آشنا ہے
گلی کے موڑ پر کوئی کھڑا ہے

جو محور لمحۂ موجود کا ہے
سمے کی ڈور سے اُلجھا ہوا ہے

اُسے مجھ سے محبت ہی نہیں ہے
مری تعظیم بھی کرنے لگا ہے

❁

مجھے مرنا کہیں بہتر لگا ہے
مجھے نامعتبر سمجھا گیا ہے

وہ مجھ سے بدگماں کیوں ہو چلا ہے
مرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے

❁

مجھے کچھ کچھ دکھائی دے رہا ہے
مگر وہ کب کا رخصت ہو چکا ہے

مرے لہجے کی شیرینی کہاں ہے
مرا حسنِ تکلم کیا ہوا ہے

مرے الفاظ کی تاثیر گُم ہے
مرا بے ساختہ پن کھو گیا ہے

سمے کا زہر بھی لمحہ بہ لمحہ
مرے اندر اُترتا جا رہا ہے

مری تارِ رگِ جاں کٹ رہی ہے
کوئی شیشہ سا دل میں ٹوٹتا ہے

زمانے کے لیے مہتابِ کامل
مری تقویم کو گہنا گیا ہے

❁

غموں کو ہنس کر گلے لگانا، خوشی سے ڈرنا عجیب سا ہے
خلوصِ دل سے بہت سے لوگوں سے پیار کرنا عجیب سا ہے

کوئی مقابل ہے آئینہ اور نہ کوئی چشمِ طلب کہیں ہے
عروسِ صبحِ جمال تیرا یونہی سنورنا عجیب سا ہے

نئی نئی آشنائیوں کی دھنک جلو میں لیے ہوئے ہے
مٹی مٹی چاہتوں کے پیکر میں رنگ بھرنا عجیب سا ہے

اُداس آنگن، اُداس زینہ، اُداس ہیں بام و در ہمارے
کرن کرن شوخ چاندنی کا مگر اُترنا عجیب سا ہے

جہاں نکھرتے گلاب کو آخر ہوا نے پہلے پہل چُنے تھے
وہیں زمانے کے بعد خوشبو تلاش کرنا عجیب سا ہے

سارا گاؤں خالی خالی، اُجڑی اُجڑی سی چوپال
اور آباد ہے چوکی، تھانہ، ضلع کچہری، دفتر مال

فصلیں، مال مویشی، چارہ، چوزے، انڈے، پھل اور پھول
جانے کس کی نظر لگی ہے گھٹتے جائیں سال بہ سال

سارے لوگوں کے حق سے پٹواری کا حق پہلے ہے
پُرکھوں کا دستور یہی تھا، ہے قانون یہی فی الحال

پیپل کی چھاؤں میں ایک شکستہ کرسی بے استاد
گاؤں کے بچے پڑھتے جائیں استحصال کو استعمال

ریشم جیسے ریشے چننے والی پیلے ہاتھوں سے
اپنے سر پر چاندی کے تاروں کا بنتی جائے جال

پھول الگ رنگوں کے ہیں پر خوشبو ایک سی ہے ان کی
غور سے دیکھو، راجہ کوثر، فرخ یار، ظفر اقبال

شہر دبے پاؤں اب کوثر گاؤں تلک آ پہنچا ہے
کس سے کریں اب دل کی باتیں کس کو سنائیں جا کر حال

سرخ، گلابی، پیلے پھول
تیرے نام ہیں سارے پھول

نرم ملائم تتلی سی
نازک ایسی جیسے پھول

گہرے نیلے آنچل میں
روشن روشن تارے پھول

تو فطرت کی دلہن ہے
تیرے جھومر جھمکے پھول

سب ہی تجھ سے پیار کریں
تتلی، کوئل، بھنورے، پھول

تیرے کوثر کتنے نام
خوشبو کلیاں گجرے پھول

تجھ کو شاید یاد تو ہوں
اُس آنگن بیلا کے پھول

مخملیں سبزے کی چادر
جس کے چار کنارے پھول

صبح کی نرمل سی کرنیں
نیند سے آنکھیں ملتے پھول

پنکھڑیوں کے آویزے
شبنم شبنم قطرے پھول

مہکی سی معصوم فضا
اور وہ مہکے مہکے پھول

اپنی البم میں رکھنا
چن کر اچھے اچھے پھول

حُسنِ ترتیب

دھوپ گلابی جاڑوں کی
دیواروں کے سائے پھول

نیند سے بوجھل آنکھوں میں
گڑیا، جگنو، سپنے، پھول

تجھ کو شاید یاد تو ہوں
اس آنگن بیلا کے پھول

مشرقی پاکستان

یاد دریچہ جب بھی کھلا
جھونکا جھونکا آئے پھول

جانے کیسی رُت آئی
رہ گئے دھوپ میں جل کے پھول

بیل تو میرے گھر میں تھی
ساتھ کے گھر میں آئے پھول

شاید وہ بھی نادم ہوں
روٹھ گئے تھے ہم سے پھول

ہم کس پر اب دوش دھریں
کیونکر ہم سے روٹھے پھول

شاید ہی اب دیکھ سکیں
ساری عمر سنہرے پھول

دریاؤں کے دیس کھلے
سُندر سُندر چہرے پھول

راستہ سُوئے کہکشاں کھولو
میرے کمرے کی کھڑکیاں کھولو

تذکرہ مہرِ دوستاں کا کرو
دفترِ رنجِ جاوداں کھولو

سارے سُود و زیاں شمار کرو
عُقدۂ عمرِ رائیگاں کھولو

آ چکا ہوں ورائے حدِ مکاں
مجھ پہ اب بابِ لامکاں کھولو

رُخ ہواؤں کا دیکھ لو کوثرؔ
اِس سے پہلے کہ بادباں کھولو

مری سیماب فطرت کا ہمیشہ دھیان رکھے گا
وہ میری ساری پہلی چاہتوں کا مان رکھے گا

ہمیشہ کے لیے وا اِک درِ اِمکان رکھے گا
خفا ہو کر بھی ہونٹوں پر وہ اِک مسکان رکھے گا

تکلم جس کا گُل افشاں، ترنم ریز خاموشی
نوازش ہائے پیہم سے مجھے حیران رکھے گا

ہوا کے نرم رو جھونکے معطر ہو کے آئیں گے
وہ ہر کھڑکی میں اِک آراستہ گُلدان رکھے گا

مرے بےنُور لفظوں میں اُجالا بن کے اُترے گا
مرے دستِ ہُنر پہ روشنی کا دان رکھے گا

مری تارِ رگِ جاں میں وہ نغمہ بن کے ٹھہرے گا
وہ میری روح میں اِک شعلۂ وجدان رکھے گا

زمانے کی ہر اِک راحت وہ میرے نام کر دے گا
جہاں بھر کے مصائب سے مجھے انجان رکھے گا

ہوائے سرد میں شاخِ ثمر رہے نہ رہے
ہرا بھرا یہ بدن کا شجر رہے نہ رہے

جو اپنے ساتھ گلابوں بھری روش پہ چلا
اُداس راہوں میں وہ ہم سفر رہے نہ رہے

گھنیری چھاؤں میں کچھ دیر بیٹھ لیں اس کی
یہ پیڑ کل کو رہِ عام پر رہے نہ رہے

چلو یہ لمحۂ رنگیں اُتار لیں دل میں
کہ کل کلاں کو یہ ذوقِ نظر رہے نہ رہے

ہم اِک صدا کی مسافت پہ آج ہیں کوثرؔ
یہ فاصلہ بھی کسے کیا خبر رہے نہ رہے

آئینۂ خیال پہ رقصاں نہیں رہا
مہرِ جمالِ یار زر افشاں نہیں رہا

تاریخ کے طویل سفر کا امین تھا
پھر کیوں حریفِ عمرِ گریزاں نہیں رہا

رستے میں چاندنی کے بھی دیوار آ گئی
برتاؤ خوشبوؤں کا بھی یکساں نہیں رہا

موجِ خیال سے گری دیوارِ خستگی
اپنے سقوط پر بھی وہ حیراں نہیں رہا

مجھ سے مرے شعور نے پہلے جنم لیا
خود سے گریز اتنا بھی آساں نہیں رہا

گہنا گیا ہے گردشِ ایام سے وہ چاند
سورج پسِ غبار درخشاں نہیں رہا

کوثرؔ گلہ ہے اب تو یہ بختِ سیاہ سے
حسنِ طلب پہ میرے وہ نازاں نہیں رہا

❁

مل کے بیٹھیں گے تو آگاہی حالات بھی ہو جائے گی
وہ اِسی شہر میں رہتا ہے، ملاقات بھی ہو جائے گی

موم بتی کو اُجالے میں جلانے سے بھلا کیا حاصل
دن بھی کچھ دیر میں ڈھل جائے گا اور رات بھی ہو جائے گی

خوگرِ لطف و کرم گرچہ یہ دل ایک زمانے سے ہے
خوئے محرومی الطاف و عنایات بھی ہو جائے گی

بارشِ سنگِ ملامت میں ذرا دیکھ مری جُراَتِ ضَم
وقت منصف ہے بَری کل کو مری ذات بھی ہو جائے گی

یہ تو طے ہے کہ نہ بدلے گا خیالات وہ اپنے کوثرؔ
یہ کٹھن وقت گزر جائے تو پھر بات بھی ہو جائے گی

❁

جو مجھ کو گھیرے ہوئے ہے مجھے سُجھائی دے
میں آنکھ بند کروں تو مجھے دکھائی دے

مری سماعتیں بیدار کر خموشی سے
نکل کے تارِ رگِ جاں سے اب سُنائی دے

اگر ہمیشہ تر و تازہ دیکھنا ہے مجھے
مجھے اسیر نہ اپنا بنا، رہائی دے

نہ خیرہ کر مجھے مانگے ہوئے اجالوں سے
مرے وجود سے پھُوٹے، وہ روشنائی دے

بعید ہے ترے جُود و کرم سے یہ کوثرؔ
کسی کو ذہنِ رسا دے کے نارسائی دے

فصلِ دوم

۱۹۹۶ء ۔ ۲۰۰۴ء

ایک ٹوٹا ہوا آئینہ مرا دستِ طلب
عکس در عکس ہے عالم تری رعنائی کا

لطفِ دائم ہے ترا، گوشۂ تنہائی ہے
یہ مرا دستِ ہنر ساغرِ مینائی ہے

حاصلِ عمر درِ یار پہ شنوائی ہے
ورنہ یہ کارِ سخن ناصیہ فرسائی ہے

ہست و معلوم مَن و تُو کے سوا کچھ بھی نہیں
اور جو کچھ بھی ہے بس انجمن آرائی ہے

سُوئے مشرق درِ کعبہ ہے سبھی جانتے ہیں
میرے خورشید جبینوں کی پذیرائی ہے

میں کہاں اور شرف مجھ کو غزل خوانی کا؟
تیری شیریں سخنی، تیری شکر خائی ہے

عارضِ صبحِ منور پہ ملاحت ہے تری
چشمِ عالم میں ترے عکس کی رعنائی ہے

ہر اکائی کی اکائی میں ترا پرتو ہے
سب عناصر میں ترے نُور کی زیبائی ہے

تُو کہے روشنی ہو جا، سو وہ ہوتی جائے
دل اُسی طرزِ تخاطب کا تمنائی ہے

ہر نفس وقفِ ثنا کر کے یہ معلوم ہوا
ترکِ ملبوسِ ہنر خرقۂ دانائی ہے

فکرِ فردا، غمِ امروز کہاں ہے کوثرؔ
تارۂ اشک ہے دامانِ شکیبائی ہے

✻

مثالِ آبِ رواں ہوں گر میں تو عکسِ ماہِ مُنیر تُو ہے
میں اِلتہابِ شعورِ اُولیٰ تو حسنِ آتش پذیر تُو ہے

مرے تکلّم کی چاشنی تُو، مرے دعاوی کا اِدّعا تُو
مرے سخن کی ضمیر تیری طرف ہے مافی الضمیر تُو ہے

جو میرے عجزِ بیاں کے پیچھے چھپا ہوا ہے وہ نُطقِ اعظم
عدیم الاشّیٰ، وحیدِ عالم، محیطِ ہر، بے نظیر تُو ہے

کہاں یہ صرف و نہاد میری، کہاں یہ بست و کشاد تیری
تُو فکرِ ہر کس کی انتہا ہے سو میرا بھی دستگیر تُو ہے

میں عکس در عکس تیرا مظہر میں نقش در نقش تیرا پَرتو
مرے چراغِ ہُنر کی لو تُو، مرا مؤیّد، ظہیر تُو ہے

سرودِ حافظؔ، شعورِ غالبؔ، ولائے رومیؔ، کلیمِ کوثرؔ
خروشِ اقبالؔ، نادِ خسروؔ، صدائے جاناںؔ و میرؔ تُو ہے

طلسم اندر طلسم پھیلا ہوا ہے بحرِ وجود کوثرؔ
حجازِ کون و مکاں میانِ خطِ صغیر و کبیر تُو ہے

بسیطِ ہر دو جہاں تلطّف سراپا دستِ طلب ہوں کوثرؔ
غلط مکانی سے متہم ہوں اگرچہ روشن ضمیر تُو ہے

❁

نظمِ عالم میں تصرف کا اجارہ نہ مجھے دے
یہ جہاں ایک خسارہ ہے، خسارہ نہ مجھے دے

نورِ اوّل بھی تو مشکوٰۃِ ظواہر میں کِھلا ہے
اپنے انوارِ مشارِق سے شرارہ نہ مجھے دے

کیا مری ارضِ طلب دشتِ تحیر سے ورا ہے
بحرِ الطاف و مراحم کا کنارہ نہ مجھے دے

کیسے رستے پہ مری خاک صبا لے کے اُڑی ہے
اب دکھائی کوئی خورشید، ستارہ نہ مجھے دے

دفعتاً پردۂ اسرارِ مسیحائی نہ کر چاک
جانِ کوثر مرے ہر درد کا چارہ نہ مجھے دے

❁

میری ابعادِ ششں جہات میں تُو
میری توجیہِ کائنات میں تُو

تیری پہچان کا قرینہ مَیں
میرے سارے مکاشفات میں تُو

تیری خواہش کا ایک پرتَو مَیں
میرے سارے مطالبات میں تُو

میری ترکیب میں تری ترتیب
میری تقلیبِ ممکنات میں تُو

میرے دستِ ہنر میں عکس ترا
میرے نظمِ تخیلات میں تُو

تیرے ہر لفظ کا حوالہ مَیں
مجھ سے مروی ہر ایک بات میں تُو

ایکتا اور انیکتا کیا ہے
مَیں تری اور میری ذات میں تُو

سب مظاہر کی علّتِ اُولیٰ
ہر طلسمِ تغیرات میں تُو

سارے انساب کو شرف تجھ سے
اور سارے مَغَائرات میں تُو

طالبِ التفات ہوں کوثر
پڑ گیا کن تکلفات میں تُو

❁

عرصۂ زیست میں سرایت کر
روحِ عصرِ رواں بغایت کر

روشنی کی بھلے حمایت کر
تیرگی پر بھی کچھ عنایت کر

میں زمانہ ہوں اور مجھ سے تُو
اپنے ہونے کی اب روایت کر

نظمِ عالم کو ارتعاش میں رکھ
التفات، اور بے نہایت کر

کوثرِ خستہ حال کو صاحب
پھر سے تُو صاحبِ ولایت کر

❁

ارژنگِ تمنائے نہانی سے الگ ہے
خورشیدِ نظر مطلعِ ثانی سے الگ ہے

ہر چند کہ تقویمِ زمانی سے الگ ہے
یہ لمحہ کہاں، کیسے کہانی سے الگ ہے

ہر لحظہ فزوں تر ہے یہ فرہنگ دلِ افروز
یہ لطف و کرم عالمِ فانی سے الگ ہے

اِک ایسی دُعا ہے کہ نہیں دستِ دُعا میں
اِک اور طلب عرضِ زبانی سے الگ ہے

یہ رنگِ سخن اور کسی سے نہیں ملتا
نیرنگیٔ الفاظ معانی سے الگ ہے

یہ رزشِ قلم نغمۂ جامؔی کی عطا ہے
یہ نظم جو ترتیب مکانی سے الگ ہے

کوثرؔ ترے لہجے میں یہ رس آیا کہاں سے
ریحانِ نفس رات کی رانی سے الگ ہے

❁

کچھ اور تقاضے ہیں یہاں سیرِ جنوں کے
ہجرت کا سبب نقل مکانی سے الگ ہے

یہ پوچھتی ہے موجِ تحیر لبِ ساحل
یہ تشنگی کیسی ہے جو پانی سے الگ ہے

ترا اِک لمس بھی کیا کیا عنایت کر گیا ہے
کہ خوشبو کا جہاں مجھ میں سرایت کر گیا ہے

وہی عکسِ زمانہ جو خراشیں ڈالتا ہے
ترے آئینۂ رخ سے رعایت کر گیا ہے

زمیں کی کوکھ سے جس کا ہے رشتہ وہ بچے گا
بھلا سا کوئی راوی تھا روایت کر گیا ہے

کہاں مَیں اور کہاں بست و کشادِ کُل کا منصب
ترا ہی اسمِ اعظم تھا کفایت کر گیا ہے

مقامِ شکر کہ غارت گرِ اقلیمِ ایماں
وہ آیا اور کام اپنا بغایت کر گیا ہے

ہنر کیا ہے بجز عرضِ ہنر کوثر مگر وہ
ترے حسنِ تکلم کی شکایت کر گیا ہے

وہ سخن پروری نہیں کرتا
میں بھی نغمہ گری نہیں کرتا

کام سیدھے سبھاؤ لیتا ہے
کوئی جادوگری نہیں کرتا

بولتے آئنوں سے صرفِ نظر
عکسِ پیغمبری نہیں کرتا

کیا کرے گا یہ رُوپ کا سونا
چارۂ بے زری نہیں کرتا

وہ مری بات مانتا کب ہے
وہ مری ہمسری نہیں کرتا

لمس کے معجزات ہیں کوثر
چاکِ گِل آذری نہیں کرتا

روپ آکاش سے ٹوٹا ہوا تارا کتنے دن رہتا ہے
جسم سنہرا، رنگ دھنک جیسا کتنے دن رہتا ہے

شیشۂ دل پر، لوحِ نظر پر، یادوں کی دیواروں پر
نقش کسی بے نام سے چہرے کا کتنے دن رہتا ہے

جس بستی کے لوگوں نے چھتنار درختوں کو کاٹا
اُس بستی پر بادل کا سایا کتنے دن رہتا ہے

اور حریمِ دل میں کوئی آئے تو مگر کیسے آئے
طاقِ طلب میں بھی ایسا ویسا کتنے دن رہتا ہے

رشتۂ جاں سے کیسے کیسے موتی ٹوٹنے لگتے ہیں
ضبطِ سخن کا بھی آخر یارا کتنے دن رہتا ہے

اور بہت ہمراہی کوثرؔ آ کر ملتے جاتے ہیں
برگِ خزاں چپ رستوں پر تنہا کتنے دن رہتا ہے

مجھ سے ہر پل گریزپا ہے وہ
وہ مری روشنی ہے کیا ہے وہ

میرے اطوار سے جھلکتا ہے
میرے لہجے میں بولتا ہے وہ

میری تہذیب کا رچاؤ ہے
میرے آثار کی ضیاء ہے وہ

میری خاموشیوں کی سرگم ہے
میری گفتار کی ادا ہے وہ

میرے احوال کا فسانہ ہے
میرے ہونے کا ماجرا ہے وہ

میرا نقشِ خیال ہے کوثرؔ
میرے اِمکان سے ورا ہے وہ

❁

جسمِ خاکی سے مری روح کا جوہر مانگے
چاہتیں روز وہ پہلے سے فزوں تر مانگے

بحرِ الطاف و مراحم کے برابر مانگے
فرصتِ عیشِ طرب اور مکرّر مانگے

چشمِ گریاں تو فقط اشکِ منوّر مانگے
دلِ صد چاک علاجِ غمِ دیگر مانگے

رشتۂ جاں سے تعارض ہے تجھے تارِ نفس
بحرِ معنی کا ہر اِک صدفہ شناور مانگے

صرفِ دلداریٔ جاناں ہے تقابل کوثرؔ
ورنہ یہ دستِ ہنر کیوں بُتِ آذر مانگے

❁

کب خاک بسر، مجمعِ آفاق نہیں مَیں
دریوزہ گرِ کوچۂ عشاق نہیں مَیں

ہرچند تری شرح کے مصداق نہیں مَیں
یہ کس نے کہا والہ و مشتاق نہیں مَیں

توسیعِ زمانی میں مرا ذکر ملے گا
با حرفِ جلی زینتِ اوراق نہیں مَیں

یہ نقدِ سخن گری بازارِ طلب ہے
پھر کیا ہے اگر رونقِ اسواق نہیں مَیں

اب پیشِ نظر عالمِ تکوین ہے کوثرؔ
اے نورِ نظر دورۂ اسباق نہیں مَیں

خوئے شیریں، تیشۂ فرہاد چھینا جا رہا ہے
مجھ سے میرا حقِ استرداد چھینا جا رہا ہے

ملکِ مانی، کشورِ بہزاد چھینا جا رہا ہے
میرا کابل، بصرہ و بغداد چھینا جا رہا ہے

تازہ کاری کے جنوں میں دستِ آذر کا ہنر ہے
جو بنامِ کارِ بے بنیاد چھینا جا رہا ہے

رنج میں اہلِ جنوں ہیں خوش نہیں پیرِ مغاں بھی
فصلِ گُل میں خرقۂ زُہاد چھینا جا رہا ہے

مسندِ رومیؔ، ولائے پیر مشرقؔ تھا جو کوثرؔ
وہ شعورِ "ہفت صد ہفتاد" چھینا جا رہا ہے

میری فریاد، عرضِ حال، وصال
التجاء، ہر دعاء، سوال، وصال

ختم کر دورِ انفصال، وصال
رہ گئے لوگ خال خال، وصال

عکسِ خالِ حطیمِ نورِ ازل
اے رُخِ کعبۂ جمال، وصال

رشکِ تجسیمِ لمحۂ موجود
وجۂ تقویمِ ماہ و سال، وصال

لمسِ معجز نُما تلطف کچھ
رونقِ محشرِ خیال، وصال

شرحِ آئینِ عشق لکھتا ہوں
مسندِ حسنِ لازوال، وصال

لا سے اِلّا کا اب نقاب اُتار
اب نہیں تابِ قیل وقال، وصال

اور پھر صبح سانس لینے لگی
قد خلت لیلۃ الجمال، وصال

جانِ کوثر یہ کب ہوا تم سے
ترکِ اندیشۂ مآل، وصال

داغ ہائے سُجود سے پہلے
اک عدم تھا وجود سے پہلے

کیسے تکوین کے مسائل تھے
کار زارِ شہود سے پہلے

آفرینش سے پیشتر کیا تھا
وقت کیا تھا حدود سے پہلے

کون تھا کائنات کا حاصل
اک وُرودِ سعود سے پہلے

تار بانی ہماری کیا مذکور
یہ کرن تھی جمود سے پہلے

نذرِ غالب کروں غزل کوثر
عفہٗ اللہ، دُرُود سے پہلے

قلزمِ عرفان و آگہی تک ہے
بات جو بھی ہے روشنی تک ہے

لمس تیرا کشید خوشبو کی
عکس تیرا سخنوری تک ہے

تجھ سے برگد کلام کرتے ہیں
تیری سرحد پیمبری تک ہے

ساری دنیا میں جو اجالا ہے
تیرے پیروں کی چاندنی تک ہے

تجھ سے کومل سُروں میں کوملتا
تیوری شانِ خسروی تک ہے

دھوپ شرمائے پیرہن سے ترے
صبح بس جوئے نقرئی تک ہے

حسنِ قوسین ارتعاش میں ہے
نظم اس لَے کی دلکشی تک ہے

کیا شمائل کے ذیل میں لکھوں
ایک مُسکان آذری تک ہے

فیض تیرا نصیبِ کُل عالم
لُطف تیرا کہ جُز رَسی تک ہے

سب مکارِم کی انتہا کوثر
اِک تغافل کہ بے رُخی تک ہے

❁

خوش نہ ہوا اظہار سے بھی
لطف لیا انکار سے بھی

کہنے کو سو باتیں ہیں
ڈرتا ہوں تکرار سے بھی

خرقہ بھی ورثہ اپنا
اور نسبت زُنّار سے بھی

آج تو پیڑ لگائیں گے
کل کے برخوردار سے بھی

ق

بیٹھے رہنے سے نہ ملے
اور سعیِ بسیار سے بھی

سرو سہی قامت میرا
جھلکے ہے اشعار سے بھی

سائے سے پہچانا جائے
پھولوں سے اثمار سے بھی

عابد حسین عابدؔ کے اس شعر پر تضمین ”اور کہاں لے جاؤ گے   لگ گئے ہم دیوار سے بھی“

جرمِ ارزانیٔ انوارِ مشارق نہ کیا کر
کام سارے ہی باندازِ صواعق نہ کیا کر

رخشِ ترتیبِ زماں اپنے مطابق نہ کیا کر
تُو زمانے کو بہر طور موافق نہ کیا کر

کس کو فرصت ہے ترا تارۂ مژگاں بھی وہ دیکھے
اپنا اندوہِ نہاں مطلعِ طارق نہ کیا کر

جو زمیں زاد ہے وہ واقفِ آلامِ جہاں ہے
خاک ساروں سے بھی مل سیرِ نمارق نہ کیا کر

خطِ امکاں سے ورا لمحۂ موجود کہاں ہے
عام لوگوں کے لیے لطفِ خوارق نہ کیا کر

کوئی واقعہ، کوئی سلسلہ، مرے بعد عجز و نیاز کا
ہوئی روشنی سرِ بزمِ جاں کہ عبث چراغِ نظر جلا

جو حریفِ عہدِ وصال تھا جو امینِ عہدِ جمال تھا
کوئی اُس کی تم کو خبر بھی ہے دلِ مبتلا دلِ مبتلا

اَے نسیمِ شہرِ سبا فدا ان کروں فرشِ راہ گُلِ نظر
مرے خوش خرام کا عکس ہے مرے گھر کی سمت کِھلا ہوا

اے صبا ٹھہر کہ شُنید ہے سرِ طاقِ جاں کوئی دیر میں
یہ مشامِ چاکِ قبائے گُل یا وہ بندِ مصحفِ جاں کھُلا

یہ نہیں مزاجِ سخنوراں میں مذاقِ نقد و نظر نہ تھا
وہ ہنر جو دستِ ہنر میں تھا بوجوہ امرِ خفی رہا

وہ سخن شناسی مہ و شاں وہ مغائرت زر و سیم سے
اُسے کیا ہوا وہ کہاں گیا وہ شرف جو اہلِ نظر سے تھا

وہ کھِلا ہوا ہے روش روش میں تفکرات کی سیج پر
اُسے بارِ خوشبو عطا ہوا مجھے کوہِ رنج و الم ملا

وہ جو ایک صاحبِ حال تھا، جسے خبطِ ذوقِ جمال تھا
مرا خوش ادا مرا کم نُما اُسے تم نے کیسے گنوا دیا

کسی کُنجِ عہدِ قدیم میں مرا دھیان محوِ خرام تھا
کہ تجلیات کی رَو چلی اُسے دیکھتا ہی مَیں رہ گیا

مرے سالموں کے مزاج میں اُسی لَمسِ کُل کا رچاؤ ہے
اُسی حسنِ یکتا کے فیض سے یہ فقیر بھی ہے غزل سرا

اے فروغِ حسنِ نظر کہاں؟ ہے تلاشِ کوثرِ خستہ جاں
کسی عہدِ رفتہ کی کھوج میں یہ خبر نہیں وہ کہاں گیا

ق

یہ معاملہ یہ مناقشہ مرے فہم سے ہے ورا ورا
تری ترجمانی کا فرض کیا بطریقِ احسن ادا ہوا

ترے چاک سے جو بچا رہا وہی گردِ ارض و سما بنا
ترے لمس کا ہے سو معجزہ مرے کوزہ گر یہ کیا دھرا

بحسودِ چشمِ رقیب وہ ہے عجب تعطلِ حال میں
جو معاملہ بڑی دیر تک بصلائے صدق و صفا چلا

ریزہ ہائے خیال

کوئی بھی نقشۂ دیوار و در اچھا نہیں لگتا
تری خوشبو نہ ہو جس میں وہ گھر اچھا نہیں لگتا

اُسے آہستہ رَو ٹھنڈی ہوائیں کاٹ دیتی ہیں
سرِ راہے کوئی تنہا شجر اچھا نہیں لگتا

کسی خوش رنگ تتلی کے تعاقب میں چلے جانا
یونہی بے سمت کا چلنا مگر اچھا نہیں لگتا

کوئی جھگڑا بھی ہے کوثر تو رستے کے تعین پر
وگرنہ کس کو خوشبو کا سفر اچھا نہیں لگتا

......

دل گرفتہ نہ کبھی ہونا، خفا ہو جانا
غیر محسوس طریقے سے جُدا ہو جانا

خود ہی اظہار کے پیمانے برت لیتا ہے
حرفِ شیریں کا سلیقے سے ادا ہو جانا

مرا وجود، مرا تذکرہ، خیال مرا
اُسے تو کچھ بھی گوارا نہیں یہی دُکھ ہے

کِھلی ہے رات کی رانی بھی فاصلے پہ کہیں
ہوا کا رُخ بھی اِدھر کا نہیں، یہی دُکھ ہے

بھلے سے پھل نہ شناسائی کے شجر پہ لگے
ہرا بھرا بھی تو رہتا نہیں، یہی دُکھ ہے

......

میرے اندر شاید کوئی بچہ چھپ کر بیٹھا ہے
جس کو اب تک جل پریوں کی باتیں اچھی لگتی ہیں

......

اِن کے کتنے بچے گر کر اپنی جان گنوا بیٹھے
اونچے پیڑوں پر چڑیوں کو گھونسلے راس نہیں آئے

......

خزاں رسیدہ شجر کی سی اُس کی چاہت ہے
کہ جس کی چھاؤں میں بیٹھو تو دھوپ لگتی ہے

زرد پتے ہیں کشیدہ سر شجر کے پاؤں میں
آ کے بیٹھا تھا کوئی سیماب پیکر چھاؤں میں

......

گر یونہی تذکرۂ علت و معلول کیے جاؤ گے
منصب بندگیٔ عشق سے معزول کیے جاؤ گے

ایک امکان میں سب کون و مکاں آج سمٹ آئے
غیر ممکن ہے کہ معلوم سے مجہول کیے جاؤ گے

ہم سے دریوزہ گرِ شہرِ سُخن حجلۂ عرفان میں ہیں
حلقۂ ماہ و شاں سائل و مسؤل کیے جاؤ گے

......

بہر صورت کسی ترکیب سے وابستہ رہنا ہے
مجھے ہر حال میں تہذیب سے وابستہ رہنا ہے

......

کئی سیماب جذبے تابعِ احکام کرنے ہیں
متاعِ زندگی کم ہے بہت سے کام کرنے ہیں

تجھ سے مروی ہوا فسانہ مرا
ہر زمانہ ہوا زمانہ مرا

تیری تقویم سے میں باہر ہوں
ہر رگِ گُل میں ہے ٹھکانہ مرا

......

تجھ سے ملے تو چپتے رہے دیر تک ہمیں
کچھ اجنبی خطوط ترے خدوخال میں

......

جان دینے سے بھلا کس کو ہے یاں جرأتِ انکار
کچھ سلیقے سے مری جان، مری جان نکالو

......

زمین پاؤں میں اور سر پہ آسماں نہ رہا
اِدھر تو دیکھ! ہمارا کوئی نشاں نہ رہا

......

جو لوحِ اول پہ مرتسم ہے وہ حرف میں ہوں وہ اسم تُو ہے
جو اپنی وحدت پہ منقسم ہے وہ حرف میں ہوں وہ اسم تُو ہے

فصلِ سوم

۲۰۰۳ء ـ ۲۰۰۵ء

کوثرؔ غریبِ دیارِ من، جُز اُو نہ کس مُحدِ یارِ من
قَد کَانَ ذالک مرّۃً فالیوم لا فالیوم لا

اِک حرفِ چمن زا ہے، ترا نام مری جاں
کیا لطفِ تعالیٰ ہے ترا نام مری جاں

ہر لوحِ نظر، تارِ نفس، شیشۂ دل پر
ہر سمت ہے ہر جا ہے ترا نام مری جاں

ہر تارکِ دنیا کے لیے حُسنِ اَوَارِد
ہر طفل کو املا ہے ترا نام مری جاں

سرداری یہاں ملتی ہے دریوزہ گری سے
اک منزلِ سلمٰی ہے ترا نام مری جاں

گلدستۂ معنی ہے تجھے سوچنا پل بھر
ریحانِ خوش آراء ہے ترا نام مری جاں

سب کون و مکاں رو میں بہے جاتے ہیں جس کی
وہ موجِ تقاضا ہے ترا نام مری جاں

ہر عالمِ تنویر میں، مشکوٰۃِ جہاں میں
والشمسِ ضحٰها ہے ترا نام مری جاں

فردوسِ معلّیٰ کی طرف صرفِ نظر کیوں
گلگشتِ مصلّٰی ہے ترا نام مری جاں

باید کہ درآں سجدہ کند ہر کہ دلش سوخت
محرابِ مُدارا ہے ترا نام مری جاں

ہر مجمعِ انوارِ مُبیں سے ہے فزوں تر
اَسرارِ تماشا ہے ترا نام مری جاں

اِس حسنِ تکلم کا اَحاطہ نہیں کوثرؔ
اعجازِ مسیحا ہے ترا نام مری جاں

شیشۂ جاں میں انعطاف رکھا
غیر محسوس انحراف رکھا

چشمِ حیراں میں کائنات رکھی
لامکاں میں کہیں مطاف رکھا

برگ میں آتشِ نمو رکھی
سنگ میں منبعِ صحاف رکھا

لوحِ دل میں موانست رکھی
اور طبائع میں اختلاف رکھا

خود کو اسرار میں رکھا پنہاں
میرے سر بارِ انکشاف رکھا

اک سراپا موافقت لکھا
ایک کو سر بہ سر خلاف رکھا

دی جو ابرِ خیال کو مہمیز
نقشِ اول ورائے قاف رکھا

پردہ داری کی شرطِ اول میں
سلسلہ ہائے اعتراف رکھا

آئینہ رُو مجھے کہا کوثرؔ
پھر تکدر سے پاک صاف رکھا

ہر ایک منفعتِ زیست کو خسارہ کہا
نگار خانۂ ہستی کو استعارہ کہا

فلک کو آئینۂ رُخ کا نقشِ خام لکھا
زمیں کو ایک چمکتا ہوا ستارہ کہا

بجز تماشا نہیں کچھ، یہ عالم موجود
درونِ سینۂ خورشید کو شرارہ کہا

جہانِ تازہ بپسِ پردۂ جنوں رکھا
معاملات کو ہر چند آشکارہ کہا

کنارے پر وہ بصد اہتمام لایا گیا
کسی نے بحرِ تحیر میں گر کنارہ کہا

بعجزِ تام ہوا میں غزل سرا کوثرؔ
کنایتاً ہی جب اس نے مجھے دوبارہ کہا

نورِ اول سے اکتساب کیا
ذرے ذرے کو ماہتاب کیا

حرفِ روشن کو باریاب کیا
مستقل زینتِ جناب کیا

شارعِ عام سے گریز کیا
عالمِ فکر سے خطاب کیا

رونقِ عرصۂ نشاط کہا
اور پھر وقفِ التہاب کیا

مسندِ عشق سے فراز ملا
جاہ و منصب سے اجتناب کیا

نصف دن سے ذرا زیادہ تھی
فرصتِ عمر کا حساب کیا

لذتِ ہجر سے کیا آگاہ
مائلِ ثروتِ ثواب کیا

شہر میں کون جانتا تھا ہمیں
ایک عالم میں انتخاب کیا

اُس کے شایاں زرِ سخن تو نہیں
پر بصد عجز انتساب کیا

کوثر اس کی یہی مشیت تھی
سو ہمیں صاحبِ کتاب کیا

مثالِ نغمۂ برگِ خزاں بکھرتے ہیں
رہِ خیال میں سب کارواں بکھرتے ہیں

ہوائے تیز میں جب آشیاں بکھرتے ہیں
ہزار سلسلۂ جسم و جاں بکھرتے ہیں

تمہاری تارِ نظر میں پروئے جاتے ہیں
ہماری فکر کے موتی کہاں بکھرتے ہیں

بنائے قصرِ سخن واں اٹھائی جاتی ہے
جہاں عناصرِ کون و مکاں بکھرتے ہیں

سمیٹ لے گی کوئی فصلِ دیر رس کوثر
برنگِ قوسِ قزح مہ وشاں بکھرتے ہیں

دو قدم بھی اگر چلا جائے
رنج ہائے سفر، چلا جائے

تارۂ شب! سحر چلا جائے
نقشِ امکان پر چلا جائے

لے کے اذنِ سفر چلا جائے
سوچتے ہیں کدھر چلا جائے

بات سے جب اثر چلا جائے
بابِ توفیق پر چلا جائے

نقش برآب ہے حکایتِ دل
کیسے بابِ دگر چلا جائے

بات جب اختیار کی ٹھہری
بات رہ جائے سر چلا جائے

اک خلا سا دکھائی دیتا ہے
جب کوئی نام ور چلا جائے

سامنے کا ہے واقعہ کوثر
دھیان کا کیا کدھر چلا جائے

ریگزارِ خیال میں کوثر
چشمۂ آب پر چلا جائے

جانے کس سمت جا رہے ہیں لوگ
اپنے مرقد بنا رہے ہیں لوگ

دن چڑھا تو عیوب کُھلنے لگے
آپ اپنا چھپا رہے ہیں لوگ

کیا تماشا ہے دُھند کے اُس پار
ایک اک کر کے جا رہے ہیں لوگ

دوسروں کی کوئی نہیں سنتا
اپنی اپنی سنا رہے ہیں لوگ

کیسی تعمیر ہو رہی ہے یہاں
اپنی تہذیب ڈھا رہے ہیں لوگ

گوشۂ راحتِ جاں، کنجِ ادب ڈھونڈ رہا ہے
دل وہی دشتِ سخن، شورِ عرب ڈھونڈ رہا ہے

بے حسی اتنی مزاجوں میں در آئی ہے کہ ہر شخص
مرگِ انبوہ میں سامانِ طرب ڈھونڈ رہا ہے

کتنا آزردۂ خاطر ہے سرِ دشتِ تمنا
چشمِ ویراں کو مۂ آخرِ شب ڈھونڈ رہا ہے

اپنے مٹتے ہوئے آثار کا نوحہ وہ لکھے کیا
عالمِ نو کو بعنوانِ غضب ڈھونڈ رہا ہے

اپنے یارانِ کہن سارے گنوا کر بھی وہ کوثرؔ
آج سنتے ہیں کوئی حدِ ادب ڈھونڈ رہا ہے

❁

کب عالمِ خیال سے آگے نہیں گئے
اندیشۂ مآل سے آگے نہیں گئے

دامن کشا تھا عالمِ امکان بھی مگر
اُس زہرۂ جمال سے آگے نہیں گئے

فکرِ رسا ودیعتِ دربارِ حُسن تھی
مجوب پُر جمال سے آگے نہیں گئے

کارِ جنوں میں اُن کو ہے دعوٰیِ ہمسری
جو لوگ قیل و قال سے آگے نہیں گئے

اِک حرفِ کُن تھا لمحۂ موجود کا حریف
پھر ہم بھی اِس سوال سے آگے نہیں گئے

واں روشنی تھی اور فقط روشنی ہی تھی
اُس بابِ اتصال سے آگے نہیں گئے

❁

بابِ حیرت کھلا، نہیں معلوم
ایسا پہلے ہوا، نہیں معلوم

شورِ محشر اُٹھا، نہیں معلوم
کس نے کیا کیا کہا، نہیں معلوم

ایک در ہم نے خود کھلا رکھا
کون آیا گیا، نہیں معلوم

ایک تو ہے سو تجھ کو جانتے ہیں
کوئی تیرے سوا نہیں معلوم

وقت کا جبر بھی الگ شے ہے
وقت سے ماورا نہیں معلوم

ضبطِ گریہ کیا نہیں معلوم
کیسے دریا چڑھا نہیں معلوم

کس تناظر میں تھا نہیں معلوم
کوئی حرفِ دعا نہیں معلوم

جشنِ نو روز تھا، نہیں معلوم
شہر کیوں جل گیا نہیں معلوم

ہم تو خاموش ہو گئے لیکن
تو بھی خوش خوش رہا نہیں معلوم

کون؟ کوثر! نہیں نہیں، کوئی اور
کتنا اچھا لگا، نہیں معلوم

ہم بھی کیا خوش گمان ہیں کوثر
خوئے اہلِ جفا نہیں معلوم

ایک گنتا ہوں دس ہزار کے بعد
ہے کوئی اور خاکسار کے بعد

عالمِ جبر اختیار کے بعد
اک تماشا ہے جیت ہار کے بعد

کیسا ٹھہراؤ اضطرار کے بعد
فکرِ تعمیر انتشار کے بعد

ساری دنیا سے کیوں شکایت ہے
ساری دنیا پہ اعتبار کے بعد

اب نگہ جائے تو کہاں جائے
روئے محبوبِ خوش دیار کے بعد

ایک وحشت سرا کہا کوثر
غنچۂ فصلِ نو بہار کے بعد

لا سے اِلّا کے درمیاں گُم ہے
فکرِ ہر کس کہاں کہاں گُم ہے

کچھ خبر بھی نہیں کہاں گُم ہے
دفترِ مہرِ دوستاں گُم ہے

سارے برگد بھی کاٹ ڈالے ہیں
سایۂ ابر، آسماں گُم ہے

سر ہمارا ابھی سلامت ہے
دُشنۂ میرِ کارواں گُم ہے

سارے کردار جیتے جاگتے ہیں
یہ بھی سچ ہے کہ داستاں گُم ہے

عرصۂ امتحاں میں ہیں کوثرؔ
اور مقصودِ امتحاں گُم ہے

ورائے شرحِ رُخِ کم نما جمال ترا
جہانِ معنی، مرے خوش ادا خیال ترا

محیطِ عالمِ امکاں ہے لمحۂ موجود
نظر نواز ہوا حسنِ لا زوال ترا

نشاطِ عمر ہے اعزازِ آشنائی جہاں
متاعِ ہر دو جہاں سے جُدا وصال ترا

بجز فریبِ نظر فاصلے نہیں کچھ بھی
بہت قریب سے ادراک تھا محال ترا

بہائے عمرِ خضر سیرِ ہفت خواں کوثرؔ
کتابِ عشق میں لکھا گیا سوال ترا

اب اس سے بڑھ کے ہو کیا ارزشِ سخن کوثرؔ
ہے عکسِ چشمِ تلطّف میں خال خال ترا

توشۂ خاص

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کآں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

بنے یہ سینۂ اخگر شہرِ زمان و مکاں
کشادِ ظرف کا مظہر شہرِ زمان و مکاں

فروغِ چشمِ منوّر شہرِ زمان و مکاں
فراخِ قلبِ میسر شہرِ زمان و مکاں

رہِ خیال برابر پکارتی ہے مجھے
چراغِ دیدۂ انور شہرِ زمان و مکاں

مثالِ بُردہ مرے شانۂ معانی پر
ردائے لطفِ مکرّر شہرِ زمان و مکاں

بدین تاب درخشم بلطفِ اسمِ محمد
مجالِ گوہرِ دیگر شہرِ زمان و مکاں

بس ایک بار سرِ عارضِ عروسِ سخن
خرامِ زلفِ معنبر شہرِ زمان و مکاں

عطا ہو بحرِ معانی سے دُرِ یک دانہ
نہ جس کا ثانی ہو یکسر شہرِ زمان و مکاں

خرامِ کلکِ گہر بار دیکھتا ہی رہوں
سفید ہے مرا دفتر شہرِ زمان و مکاں

زرِ جمال و خطوطِ شمائلِ اکرم
سرِ خریطۂ احقر شہرِ زمان و مکاں

پیامِ لطف و کرم از جنابِ حُسنِ ازل
کہاں پھروں گا میں دردر شہرِ زمان و مکاں

خطِ وریقہ سرِ برگِ آرزوئے نہاں
بفیضِ گنبدِ اخضر شہرِ زمان و مکاں

علاجِ تشنہ لبی صد ہزار بحرِ جمال
کنارِ چشمۂ کوثر شہرِ زمان و مکاں

عطائے خاص ہے کوثرؔ یہ نظمِ دلآویز
یہ مُشتِ خاک، سخنور! شہرِ زمان و مکاں